

بیادِ

شورِیدہ کاشمیری

ترتیب

ڈاکٹر غلام رسول ملک — ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

اقبال اکیڈمی سرینگر کشمیر

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. 8[redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

بیادِ شوریدہ کاشمیری

ترتیب

غلام رسول ملک □ بشیر احمد نحوی

اقبال اکیڈمی سرینگر کشمیر۔

جملہ حقوق بحقِ اقبال اکیڈمی محفوظ ہیں

نام ـــــ بیادِ شوریدہ کاشمیری

سالِ اشاعت ـــــ ۱۹۹۲ء

طباعت ـــــ جے، کے آفسیٹ پریس دہلی

قیمت ـــــ ۳۰، روپے

سرورق ـــــ غلام احمد

ترتیب

		صفحہ نمبر
• پیش لفظ	غلام رسول ملک	۷
• شوریدہ کاشمیری	پروفیسر حامدی کاشمیری	۲۰
• کتنا دِلسوز ہے یہ شوریدہ	پروفیسر مرغوب بانہالی	۲۵
• پروفیسر شوریدہ کاشمیری ——— (حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا)	ڈاکٹر بشیر احمد نحوی	۳۱
• شوریدہ — ایک شاعر	ڈاکٹر قدوس جاوید	۳۷
• قلندرانہ مزاج کا شاعر	غلام نبی ہاگرو (ایڈووکیٹ)	۴۵
• شوریدہ کاشمیری ایک صاحب فکر شاعر	سیّد رسول پونپر	۵۵
• شوریدہ کاشمیری — چند یادیں۔ چند باتیں	پروفیسر الطاف حسین	۷۹
• شوریدہ کاشمیری — شخص اور شاعر	محمد شفیع خان	۹۱
• تعزیتی پیغام	پروفیسر قاضی غلام محمد	۱۰۸
• خراج عقیدت منجانب اہالیان نئی بستی اسلام آباد۔	———	۱۰۹
• ایک خط، ایک نظم، ایک مضمون	مقبول احمد	۱۱۱
• میرے محترم استاد	مولوی حمید اللہ	۱۱۸
• شوریدہ — بلبل کشمیر اردو نغمہ خواں	غلام نبی ناظر	۱۲۲

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

اِنتساب

پنجورہ شوپیاں کے سبزہ زاروں کے نام

جن کے اُوپر شوریدہ نے اپنا لڑکپن گذارا ہے

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. 8 [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

غلام رسول ملک

پیش لفظ

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سُلطاں کی درگاہ

مرحوم شوریدہ کشمیری کی یاد میں مضامین کا یہ مجموعہ ایک کوشش ہے. وہ حق ادا کرنے کی جو اُن کی طرف سے ہم پر عائد ہوتا ہے۔ انکی زندگی میں گوناگون وجوہات کی بناء پر انہیں وہ قدر و منزلت نصیب نہ ہو سکی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ ان میں سے چند وجوہ ایسی ہیں جو براہ راست انکی ذات اور انکے بے نیازانہ طرز زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جو ان حالات کا منطقی نتیجہ ہیں جو جان بوجھکر ہم پر مسلّط کئے گئے۔ ان حالات میں ذرائع ابلاغ، سرکاری سرپرستی اور دوسرے کھلے اور چھپے وسائل کے ذریعے معیاروں کی کایا پلٹ دی گئی۔ نااہلوں کو اہل، جاہلوں کو ذہین و فطین، بے دانشوں کو دانشور اور غیر شاعروں اور متشاعروں کو وقت کا حافظ و خیام بنا دیا گیا۔ جو جتنی آسانی اور سُرعت کے ساتھ اور جتنے کم داموں پر بکنے کے لئے تیار ہو گیا اتنا ہی اُس کا قد اونچا کر دیا گیا۔ جمہوریت اور سیکولرازم کے بلند بانگ دعاوی

کے باوصف، جس شخص کا نظریہ حیات سرکاری نظریہ سے مختلف نظر آیا اُسے نفرت و حقارت کے ساتھ نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسے متعفن ماحول میں شوریدہ جیسے پاکیزہ فطرت، قلندر طبع اور صاحب ضمیر آدمی کے لئے گم نام رہنا اس نام و نمود کے مقابلے میں بدرجہا بہتر تھا جس کے لئے ایمان اور ضمیر کی صورت میں قیمت چکانا پڑتی ہے۔ کچھ وجوہات کا تعلق اُس دائمی اور ابدی مگر تلخ حقیقت کے ساتھ ہے جس کے تحت سوائے چند خوش نصیبوں کے تاریخ میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ عظیم صلاحیتوں کی حامل شخصیتوں کو اپنی ہی زندگی میں سندِ قبول حاصل ہو۔ بہرحال وجوہات کچھ بھی رہی ہوں شوریدہ کی زندگی میں اُنکے ساتھ انصاف نہ ہوسکا۔

یہ مجموعہ مضامین تلافی مافات کے دعوے کے ساتھ پیش نہیں کیا جارہا ہے۔ اس کی حیثیت ایک خراج عقیدت کی ہے۔ جو مرحوم کے دوستوں، شناساؤں اور شاگردوں نے انہیں پیش کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر مضامین ان تاثرات پر مبنی ہیں۔ جو شوریدہ صاحب کے جاننے والوں نے انکی صحبت میں رہکر انکی شخصیت اور انکے کردار کے بارے میں قائم کئے تھے۔ ان میں خاص طور پر پروفیسر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر نحوی، پروفیسر الطاف حسین، پروفیسر مرغوب محمد شفیع خان ا۔ غلام نبی ہاگرو کے مضامین مرحوم کی ذات کے ساتھ وابستہ یادوں پر مشتمل ہیں۔ اس قسم کے تاثرات کی ادبی قدر و قیمت ادب کے ہر طالب علم پر واضح ہے۔ مستقبل کا ناقد انہی تاثرات پر شوریدہ کی شخصیت کی تعیُن اور انکی شاعری کی قدر سنجی کی بنیاد قائم کرے گا۔ رہی شوریدہ کی شاعرانہ حیثیت تو اس پر سیر حاصل اور معروضی بحث کے لئے ہمیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا ابھی شوریدہ اور انکے ناقد کے درمیان وقت کا وہ ناگزیر فاصلہ قائم نہیں ہو پایا ہے۔ جو تمام ذاتی علایق اور غیر ادبی محرکات سے بالاتر ہو کر شعر کو شعر کی حیثیت سے دیکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس مجموعۂ مضامین میں شوریدہ صاحب کی شاعرانہ حیثیت کے بارے میں جو بھی اشارات کئے گئے ہیں انہیں اس پس منظر سے الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ ڈاکٹر عبدالقدوس جاوید کا مضمون البتہ شوریدہ کو ادبی حیثیت سے پرکھنے کی اوّلین

کوشش ہے اور قاضی صاحب کے مختصر اشارات اس ضمن میں دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲)

شوریدہ مرحوم کے ساتھ میری پہلی شناسائی اس وقت ہوئی تھی جب ۱۹۶۱ کے وسط میں، میں نے گورنمنٹ ڈگری کالج اسلام آباد میں داخلہ لیا۔ اس وقت شوریدہ صاحب پورے کالج میں بہت ہی ہر دلعزیز استاد کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ انکی سادگی، بے نیازی اور منکسر المزاجی نے ہر کسی کا دل موہ لیا تھا۔ سائنس اور آرٹس کے طالب علم یکسان طور پر انکی عزت کرتے تھے۔ اردو زبان و ادب اگرچہ میرے مضامین میں شامل نہیں تھے۔ تاہم کالج میں داخلہ کے دو مہینے کے اندر اندر میرا شوریدہ صاحب کے ساتھ قریبی رابطہ قائم ہو گیا۔ اس زمانے میں کالج میں انگریزی اور اردو کے لئے مباحث کی الگ الگ انجمنیں قائم تھیں اور طلباء میں سے انکے لئے سکریٹری مقابلے کی بنیاد پر منتخب ہوتے تھے۔ اسی طرح کالج میگزین کے انگریزی، اردو اور کشمیری شعبوں کے لئے طالب علم مدیروں کا انتخاب انکے لکھے ہوئے مضامین کے معیار کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ شوریدہ صاحب نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں انگریزی انجمن مباحثہ (DEBATING SOCIETY) کا سکریٹری اور میگزین کے انگریزی سیکشن کا طالب علم مدیر منتخب ہوا تھا اردو کے لئے بھی یہ دونوں ذمہ داریاں میرے سپرد کر دیں۔ اسطرح ان کے ساتھ ایک ایسا تعلق قائم ہوا۔ جو برابر چار سال تک جاری رہا۔ افسوس کہ اس زمانے کی اکثر یادیں میرے ذہن سے محو ہو گئی ہیں۔ صرف چند واقعات حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں۔

غالباً میرا کالج میں پہلا سال تھا جب میگزین کے اردو سکیشن میں شوریدہ صاحب کا ایک مضمون ذیل کے عنوان کے ساتھ شائع ہوا :۔

"ہے کوئی جو مجھے اقبال کے اس شعر کے معنی سمجھائے ؎

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
کہ حق نے دل کو کیا ہے نگاہ کا پیرو؟

شوریدہ صاحب کا سوال تھا کہ دل کا فیصلہ نگاہ سے نہیں بلکہ نگاہ کا فیصلہ دل سے ہوتا ہے اور یہ کہ حق نے نگاہ کو دل کا پیرو بنا دیا ہے۔ دوسرے روز میں انکی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے لگتا ہے کہ اس شعر میں اقبال نے نگاہِ جسمانی کا نہیں بلکہ اس نگاہ روحانی کا ذکر کیا ہے جس کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں :۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اِسکے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یا

وہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

کہنے لگے "بات تو تم ٹھیک کہتے ہو مگر میرا ذہن اب بھی اس بارے میں صاف نہیں ہے"

اس زمانے میں جب کوئی مشاعرہ ہوتا تھا تو حلقۂ سامعین میں ہر طرف سے بالخصوص سینیر طلباء کی طرف سے شوریدہ صاحب سے انکی نظم طمانچہ سنانے کی فرمائش ہوتی تھی۔ لڑکوں نے شوریدہ صاحب کا منہ کیا دیکھا کہ 'طمانچہ' 'طمانچہ" کی آوازیں بلند ہوئیں لیکن جہاں تک میری یاد کا تعلق ہے انہوں نے کبھی بھی یہ فرمائش پوری نہ کی بس اسے ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔

کالج کے چار سالہ زمانۂ تعلیم میں ہمیں ہر سال کالج میگزین کا انتظار رہتا تھا تاکہ شوریدہ صاحب کی نئی غزل یا نظم سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملے۔ ان میں سے ہم اکثر اشعار ازبر کر لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں اور میرے ساتھی قاری غلام حسن نے انکی ؎

دردِ انگیز وہ غزل گاؤں
سینۂ عرش کو بھی برماؤں

مطلع والی غزل اسی طرح یاد کرلی تھی۔

۱۹۷۰ء کے اواخر میں، میں ڈگری کالج پونچھ سے ٹرانسفر ہو کر اسلام آباد کالج میں انگریزی کے اُستاد کی حیثیت سے داخل ہوا اور اس طرح کئی سال کے وقفے کے بعد شوریدہ صاحب کے ساتھ پھر سے رشتہ قائم ہو گیا۔ اب ہم لوگ مل کر مجالس مباحثہ کا انتظام کر لیتے تھے۔ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور کالج میں جو چھوٹے موٹے ادبی کام ہوتے تھے ان میں ایک دوسرے کی معاونت کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک معیاری ادبی جریدے کیلئے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا تو ہم دونوں اس کے ممبر ہو گئے۔ اس سلسلے میں کئی دفعہ انکے دولت کدے پر میٹنگ ہوئی لیکن اس تمام تگ و دو کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کشمیر کو اب تک ایک معیاری ادبی جریدے کا بدستور انتظار ہے۔ اس زمانے کے متعلق ایک ایسا واقعہ میرے ذہن میں محفوظ ہے جو شوریدہ مرحوم کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

اتوار کا دن تھا۔ میں آرڈنی میں اپنے گھر میں تھا کہ میری ایک ہمشیرزادی میرے کمرے میں آئی اور کہنے لگی کہ ایک طویل القامت شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں کمرے سے باہر آیا تو دیکھا کہ شوریدہ صاحب متبسم چہرے کے ساتھ سامنے کھڑے ہیں۔ میں نے مسرت کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور انہیں کمرے کے اندر لے گیا۔ ابھی وہ بیٹھے بھی نہ تھے کہ جھٹ اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ کہنے لگے "ملک صاحب، ایک مشکل آن پڑی ہے۔ جامعہ اردو علی گڈھ والوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اسلام آباد کے امتحانی مرکز میں ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات کا اہتمام کروں۔ اسکے لئے وہ مناسب معاوضہ دے رہے ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کام کیسے کیا جائے اسی لئے میں اسلام آباد سے یہاں آیا ہوں۔ میرا دل بے ساختہ پکار اُٹھا ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

میں نے عرض کیا کہ آپ چائے شائے پی لیجئے۔ یہ کونسا ایسا مسئلہ ہے کہ آپ پریشان

ہو رہے ہیں۔ نہ جانے کتنے لوگ امتحان کی نگرانی کے لئے تیار ہونگے۔ آخر معاوضے پر ہی تو کام کرنا ہے۔ اس کے بعد میں نے کاغذ پر نگران عملے کا ایک نقشہ بنا کر اُن کے سپرد کر دیا۔ گھنٹہ بھر بعد وہ کہنے لگے کہ اب میں جاؤں گا۔ میں اُن کو رخصت کرنے کے لئے انکے ساتھ باہر سڑک تک آیا وہاں اُنکی موٹر بائیک کھڑی تھی۔ اب وہ چابی کے لئے اپنے کوٹ کی جیب ٹٹولنے لگے تو چابی غائب۔ ہر جیب کو چھان مارا مگر چابی گم۔ کہنے لگے کہ وہ شاید آپ کے کمرے میں گر گئی۔ میں نے ایک بچے کو اوپر دوڑا دیا وہ چند منٹ بعد واپس آیا اور کہنے لگا کہ چابی وہاں بھی نہیں ہے۔ اسکے بعد ہم دونوں دوبارہ تلاش کے لئے اوپر چلے آئے مگر چابی کا کہیں نام و نشان نہیں۔ آخر میں نے عرض کیا کہ آپ رات بھر یہیں قیام فرمائیے۔ صبح ہم ساتھ چلیں گے اور بائیک کو بس کے اوپر ڈالدیں گے۔ جواب میں فرمایا کہ وہ تو میں اب بھی کر سکتا ہوں۔ اس کے لئے رات بھر یہاں قیام کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ ہم اسی مخمصے میں تھے کہ اچانک انہوں نے اپنا ہاتھ کوٹ کی بیرونی جیب میں ڈالدیا اور کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا کہ یہ دیکھئے بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں۔ کوئی چاہے تو اسی ایک واقعہ کے آئینے میں شوریدہ صاحب کی شخصیت کے تمام خدّوخال دیکھ سکتا ہے۔

شوریدہ صاحب کے ساتھ میری آخری یاد اس پیش لفظ کے تعلق سے وابستہ ہے جو انہوں نے میری کتاب، ——— :- THE BLOODY HORIZON

A STUDY OF IQBAL'S RESPONSE TO THE WEST.

پر لکھا تھا۔ یہ شاید اُنکی زندگی کی آخری ادبی تحریر تھی۔ اس سے پہلے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ انگریزی پر اس قدر دسترس رکھتے ہیں۔ افسوس کہ وہ اپنی اس آخری ادبی تحریر کی اشاعت سے پہلے ہی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

۳

سیرت و کردار کے اعتبار سے شوریدہ مرحوم صحیح معنوں میں مردِ قلندر تھے۔ اقبال اور انکے منبع فیضان یعنی قرآن و سنت کے ساتھ انہیں والہانہ عشق تھا اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اقبال کے مردِ قلندر (جو قرآن کے مردِ مومن کی حسین شاعرانہ تعبیر ہے) کی صفات کا عکس انکی شخصیت میں جلوہ گر ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں، میں خاص طور پر انکی دو نمایاں صفتوں کا ذکر کروں گا ـــــ دنیا سے انکی بے رغبتی اور اُنکی ظاہر و باطن کی ہم آہنگی و یک رنگی۔

مومن نہ تو دنیا کو تج دیتا ہے اور نہ ہی اسکی ظاہر فریبیوں میں مبتلا ہو کر اللہ اور دار آخرت کو بھول جاتا ہے۔ وہ دنیا کو ایک وسیلۂ فلاحِ آخرت کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔ اسے اپنے مساعی کی واحد منزل نہیں بناتا۔ وہ زندگی کی ذمہ داریوں سے تو راہ فرار اختیار نہیں کرتا مگر حیاتِ عارضی کے لئے حیاتِ ابدی کو برباد نہیں کرتا اُسکی دعا ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھلائی عنایت فرما اور آخرت میں بھلائی عنایت فرما اور دوزخ کی آگ سے بچا) دنیا سے مومنانہ بے رغبتی اسی رجحان طبع کا نام ہے۔ شوریدہ صاحب نے دنیاوی عزّ و جاہ کو کبھی اپنی منزلِ مقصود نہیں بنایا۔ وہ چاہتے تو کچھ بھی حاصل کر سکتے تھے مگر اس کے لئے دنیا کے کتنے جو قیمت ادا کرتے، میں وہ مومن شوریدہ کے لئے ناقابلِ تصور تھا۔ میں جب بھی شوریدہ صاحب کو دیکھتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث یاد آتی۔ کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ۔ (بخاری عن عبداللہ بن عمرؓ)

(دنیا میں اسطرح رہو جیسے کوئی پردیسی یا مسافر رہتا ہے)

اور اقبال کے مردِ درویش کا چلتا پھرتا عکس جنّتِ نگاہ بنکر سامنے آتا تھا ؎

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

شوریدہ صاحب کی وفات کے بعد جب انکی یاد میں منعقد ہونے والے جلسے میں شرکت کی غرض سے ہم لوگ سرینگر سے اسلام آباد جارہے تھے تو میں راستہ بھر میں عالم تصور میں انہیں اقبال کے مردِ قلندر کے معیار پر پرکھ رہا تھا۔ ضربِ کلیم کی مختصر نظم مومن (دنیا میں اور جنت میں) میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ دنیا میں مومن کی شان یہ ہوتی ہے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اور جنت میں اُسکی شان یہ ہوتی ہے کہ

کہتے ہیں کہ فرشتے کہ دلاویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

شوریدہ کے کردار میں ریشم کی نرمی اور فولاد کی سختی کے مظاہر، جو رُحَمَاءُ بَیْنَھُم اَشِدَّاءُ عَلَی الکُفَّار کی عملی تعبیر لگتے تھے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور یہ بھی معلوم تھا کہ 'طمانچہ' لکھنے کے باوجود 'طمانچہ' کا مصنف کس قدر کم آمیز اور باحیا تھا مگر فرشتوں کے لئے اُنکی دلاویزی کا عملی مظاہرہ ابھی نظروں کے سامنے نہیں آیا تھا سو اُنکی یاد میں منعقدہ جلسے میں وہ منظر بھی آنکھوں نے دیکھ لیا۔ ایک فرشتہ خصلت اور صالح فطرت نوجوان، مولوی حمید اللہ صاحب جو کبھی ہمارے (میرے اور مرحوم شوریدہ کے) طالب علم تھے مگر اب ماشاء اللہ اپنی پاکیزہ سیرت اور علم و فضل کی بدولت ہمارے مخدوم بن گئے ہیں، شوریدہ صاحب کو خراجِ عقیدت ادا کرنے کے لئے اسٹیج پر آئے اور ابھی انہوں نے کلام کا آغاز بھی نہ کیا تھا کہ انکی ہچکیاں بندھ گئیں اور اکثر سامعین زار و قطار رونے لگے۔

یا اللہ کیا عظمت تھی اُس فقیرِ بے نوا میں جو وہ دلوں کے اندر اس قسم کے جذبات محبت جگا سکتا تھا؟

انکی ظاہر و باطن کی ہم آہنگی ایک ایسا وصف تھا جس سے انکا ہر جاننے والا بخوبی

واقف ہے۔ اس مجموعۂ مضامین میں اِس وصفِ قلندرانہ کے شواہد بار بار سامنے آئیں گے۔
اس سلسلے کی آخری بات پھر اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

(۴)

شوریدہ مرحوم ایک اچھے روایتی اردو شاعر تھے۔ انکی طبیعت فطرتاً موزون تھی اور اردو زبان پر، جس میں وہ شعر کہتے تھے، انہیں کماحقہٗ قدرت حاصل تھی۔ بڑے شعراء کے یہاں جو وسعت، تنوّع اور گہرائی پائی جاتی ہے اُن کا انہوں نے نہ تو کبھی دعویٰ کیا اور نہ ہی اُن کی شاعری میں اِن خصوصیات کی تلاش کرنا ہمارے لئے حق بجانب ہوگا۔ کشمیر کی اُردو شاعری میں البتہ وہ اپنی حدود کے اندر اندر بلاشبہ ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں اور شومیِ قسمت سے انکی زندگی میں اس امر کا بہت کم اعتراف کیا گیا۔

شوریدہ کی شاعری بامقصد ہے ذہنی عیّاشی کے قبیل کی چیز نہیں مگر یہ پہلے شاعری ہے اور پھر کچھ اور۔ حقایقِ حیات کا شعور اور اِن کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی لگن، روایت کی پاسداری اور ایک مخصوص شوریدہ صفت مزاحیہ لے اس شاعری کے نمایاں خدوخال ہیں۔

اپنی شاعری کے بامقصد ہونے کا شوریدہ کو پورا شعور حاصل ہے ؎

شوریدہ ہے تیری شاعری کیا
خیر و حق و حسن کی ادا بند

اس خیر و حق و حسن کا منبع و مبداء ذاتِ باری تعلیٰ ہے جسکے وجود کی گواہی ہر ذرّہ کائنات دے رہا ہے اور جسکی بندگی و غلامی کی ہر شے بزبان حال اعلان کر رہی ہے ؎

چاند تاروں میں، بحر و بر میں ہے ڈھونڈتے کیا ہو حجّت اسلام
چیر لو کائنات کا سینہ دیکھ لو اس میں فطرتِ اسلام

اسلام (بندگی و اطاعت الٰہی) کا راستہ اللہ کے پیغمبروں نے سکھایا ہے اور خاتم النبیین نے اس تعلیمِ ہدایت کی تکمیل کی ہے اور شوریدہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو 'مے کشِ ساقیِ حجازی' 'غلامِ محمدؐ' اور 'مے نابِ حجاز' کا رسیا قرار دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ زندگی کی تعمیر منفی بنیادوں پر نہیں کی جا سکتی۔ اسکے لئے مثبت حقایق پر ایمان لازمی ہے ؎

پکارتا ہے زمانے کو حرفِ الا اللہ
جہاں میں عقدہ کشا حرفِ لا الاہ نہیں

یہ بات کہ شوریدہ حقیقی معنوں میں شاعر ہیں انکی ہر نظم اور غزل سے واضح ہے۔ انکی منظومات بالخصوص شعریت سے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ ان میں ڈل کا منظر۔ نغمۂ نوبہار۔ نغمۂ محبت، نیرنگِ زمستان۔ سیبِ عنبریں اور جوگی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آخری دور کی منظومات کے مقابلے میں انکی ابتدائی دور کی منظومات میں تخلیقی دباؤ زیادہ شدید اور گہرا نظر آتا ہے۔ غزل میں وہ روایت کے پابند رہنے کے باوجود کبھی کبھی بہت اچھے شعر کہتے ہیں جو انکی مخصوص شخصیت اور انداز نظر کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا کہوں یار کو کدھر دیکھا درمیانِ دل و جگر دیکھا
وہ تو اک داغِ دل ہمارا تھا اُنکی مژگاں پہ جو ستارا تھا
چشمِ ساقی کا وہ پیام و کلام استعارہ در استعارہ تھا
آنکھوں پہ پڑے حجاب لاکھوں اس طرح وہ بے نقاب گذرا
لوگ جب تیرا نام لیتے ہیں دل کو ہم تھام تھام لیتے ہیں
حشر ساماں جنوں کا تھا انداز ہم نے دیکھے کہاں نشیب و فراز

راہ میں آئے جب کوئی دیوار　　سر کو وحشت میں سنگ کرتے ہیں
خاک پاکِ وطن ہے مردم خیز　　یہی شیراز ہے یہی تبریز

محفلِ رنداں میں جب موجود شوریدہ نہ تھا
مُغ بچے آئے تو کیا پیرِ مغاں آیا تو کیا
کوئی وہ اہل دل نہیں جس سے کشودِ قلب ہو
ڈھونڈ رہا ہوں سو بسو، گھوم رہا ہوں کو بہ کو
یا دیدہ وری مجھے عطا کر　　یا چاک نقاب راز کر دے

شوریدہ کو اردو فارسی ادبیات کی روایت کا گہرا شعور ہے۔ سعدی۔ رومی۔ حافظ۔ میر۔ درد، غالب اور اقبال ان عظیم فنکاروں میں نمایاں ہیں جن کا ان پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے۔ ان کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے قدم قدم پر اساتذہ کی یاد آتی ہے۔ روایت کا یہ شعور اور اسکے ساتھ مطابقت کی خواہش ہر اچھے فنکار کی لازمی صفت ہے مگر ایک بڑا فنکار روایت کے فریم میں اپنی انفرادیت کی تصویر فٹ کرتا ہے۔ وہ روایت کے اندر گم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ اس کو اپنے اندر سمو کر اس پر اپنی مہر انفرادیت ثبت کرتا ہے۔ شوریدہ کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے روایت کی پاسداری اکثر زنجیرِ پا بن گئی ہے جس نے انہیں عصر جدید کے تقاضوں سے بڑی حد تک غافل کر دیا ہے اور جس کے بوجھ تلے انکی مخصوص انفرادی لے دب کر رہ گئی ہے۔ دور حاضر کی شاعری کے متعلق اُن کا یہ شکوہ بجا ہے کہ،

دور حاضر کی شاعری یارو
جس میں لیلےٰ نہیں وہ محمل ہے

جدید شاعری کے نام پر جو لغویات سامنے آرہی ہے، حقیقی شعر و ادب کی حفاظت کیلئے ہر تخلیقی فنکار اور قاری کے لئے اس سے احتراز کرنا ضروری ہے۔ لیکن اسے تخلیقی سطح پر

عہد حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہ ہونے کا بہانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ شوریدہ صاحب میں عہد حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بلاشبہ موجود ہے۔ نہیں تو وہ اس قسم کے اشعار کیسے کہہ سکتے ؎

وہ بوڑھا عجب شعبدہ باز تھا　　بالآخر شجر میں اٹکتا رہا

بھیڑو جنگل کی راہ لے لو　　اس شہر میں بھیڑیے بہت ہیں

لیکن یہ دونوں اشعار شاذ ہیں۔ اس قسم کا کوئی اور شعر انکی شاعری میں موجود نہیں۔

روایت کی حدِ مناسب سے زیادہ پاسداری سے شوریدہ کی اپنی انفرادی لے جو بہت جاندار اور جمالیاتی اعتبار سے بہت تسکین بخش ہے، دب کر رہ گئی ہے۔ اس مخصوص لے کا تعلق اُس غیر شعوری مزاح (UNCONSIOUS HUMOUR) کے ساتھ ہے جو انکی شخصیت کا جزوِ لاینفک ہے۔ شعوری طور پر اور جان بوجھ کر مزاح پیدا کرنا ایک ایسا وصف ہے جو سعی اور کسب سے بھی کسی حد تک حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن غیر شعوری اور وجدانی طور پر اشیاء و حوادث کے مزاحیہ پہلو کو بھانپ لینا ایک وہبی ملکہ ہے جو ہر کہہ ومہ کو حاصل نہیں ہوتا۔ شوریدہ کے اندر یہ صلاحیت فطرتاً ودیعت ہے مگر افسوس کہ انہوں نے اس کو پروان چڑھانے کی طرف مناسب توجہ نہیں دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ابتدائی دور کی شاعری میں اس کے مظاہر بار بار سامنے آتے ہیں وہاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لے مدھم ہوتی چلی جاتی ہے اور بالآخر ناپید ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ مزاح غیر شعوری ہے اسلئے سنجیدہ غزلیات میں ایک زیریں رو (UNDERCURRENT) کی صورت میں راہ پاتا ہے۔ اور شوریدہ کے پہلے مجموعۂ کلام 'جوشِ جنون' کی غزلوں سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں ؎

آج کل معشوق بھی ہیں خستہ حال　　اے دلِ عاشق تجھے کیوں ہے ملال

تڑپنے پہ میرے کہا یار نے　　اہا ہا تماشا ہے کیا یہ عجب

وہ جب آنکھیں اٹھاتا ہے تو میں اپنی جھکاتا ہوں
اور اپنی جب اُٹھاتا ہوں تو وہ اپنی جھکاتا ہے

پہلے جاتا ہے یاں سے خونِ جگر — پھر ولایت سے مال آتا ہے
میرے پاس آنے میں جھجک کیا ہے — درمیاں میں پلِ مراط نہیں
سنگِ در گھس گیا ترا اے دوست — کچھ تو دے اس جبین و سر کی داد

مطائبات کے زیرِ عنوان شوریدہ صاحب کی جو نگارشات شامل ہیں اس میں مزاح کی یہ صلاحیت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک نظم کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جو اندر بھی ہو تو ڈرے اندر اسے — یہاں ہر دلاور بنا ہے ڈرن سنگھ
خدا ہی ڈبوئے، خدا ہی ترائے — کوئی ہے ڈبن سنگھ، کوئی ترن سنگھ
ملیگی حکومت، صدارت، وزارت — بن خان بن جائے جسدم بن سنگھ

شوریدہ ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ لیکن اردو ادب میں بالعموم اور کشمیر کے اردو ادب میں بالخصوص اپنا نام اس طرح ثبت کر دیا ہے کہ اب یہ کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتا ؎

دیکھ شوریدہ لوگ کرتے ہیں
ہمیں خانہ خراب کی باتیں

پروفیسر حامدی کاشمیری

شوریدہ کاشمیری!

؎ نرالی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں

سنہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے، میں ایس، پی، کالج میں زیر تعلیم تھا، ایک روز لٹریری کلب، جس کا میں سکریٹری تھا، کی ایک خاص نشست کے بعد غیر رسمی گفتگو میں شوریدہ کاشمیری کا ذکر چلا، میں کالج میں اپنے پیشروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں خصوصی دلچسپی لیتا تھا، شوریدہ کاشمیری کے بارے میں جب میں نے سنا کہ اُن کو ایک ہم جماعت غیر مسلم لڑکی سے اظہار عشق کرنے پر اس کے ہاتھ طمانچہ کھانا پڑا، اور پھر انہوں نے طمانچہ کے عنوان سے ایک مزاحیہ اور طنزیہ نظم لکھی ہے، تو مجھے بیحد تعجب ہوا، نظم کے چند اشعار سننے کے بعد ایک مصرع میرے ذہن پر نقش ہو گیا ؎

کیا خوب ملا بر سر بازار طمانچہ

میں سوچتا رہا کہ اس نظم کا خالق کوئی بوہیمین ٹائپ کا شاعر ہوگا، خطر پسند اور لاابالی، شیلے یا مجاز کی طرح، اُنہیں دیکھنے کی خواہش میرے دل میں کروٹیں لیتی رہی، لیکن یہ خواہش تادیر پوری نہ ہو سکی۔ آخر کالج ہی میں ایک کل ریاستی مشاعرے میں، جسکی صدارت

محترم مرزا عارف بیگ کر رہے تھے، مجھے اُنہیں دیکھنے کا موقع ملا، سٹیج پر ایک سیدھا سادھا، لمبا تڑنگا اور دبلا پتلا دیہاتی وضع کا کھردرا سا انسان کھڑا تھا، ڈھیلے ڈھالے پرانے سے سوٹ میں ملبوس اُس نے جب سہل ممتنع میں غزل کا پہلا ہی شعر سنایا تو میں اُس کے عجیب و غریب دہقانی لب و لہجہ سے سناٹے میں آگیا، لیکن ہال میں سامعین جوش و خروش سے داد دے رہے تھے، اور پھر حاضرین کی فرمائش پر جب اُنہوں نے اپنی نظم" طمانچہ " سنائی، تو میں اِس "مجموعۂ اضداد" کو عالم استعجاب میں دیکھتا ہی رہا۔

پھر کئی برسوں تک شوریدہ صاحب کو سری نگر میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں سننے کا اتفاق ہوا، آہستہ آہستہ میں اُن کے لہجے اور طرزِ ادا سے مانوس ہوتا گیا،

ایک بار مجھے یونیورسٹی کے امتحانات کے سلسلے میں اننت ناگ جانا پڑا، میں شوریدہ صاحب سے ملنے اُن کے گھر گیا، وہ غالباً کرایہ کے مکان میں رہتے تھے، گھر سادگی اور تنگ دستی کا مظہر تھا، شوریدہ صاحب اپنی فطری سنجیدگی کے باوجود شفقت سے ملے، اُنہوں نے چائے سے میری تواضع کی، اور میں محسوس کرتا رہا کہ اُن کی گھریلو اور روزمرہ کی زندگی تکلف اور بناوٹ سے بالکل پاک و صاف ہے، وہ وضع قطع، افتادِ طبع، لباس اور مجلسی روابط میں ایک انفرادی قلندرانہ شان رکھتے ہیں، اور اسی پر کاربند ہیں، وہ "ستائش اور صلے" سے لاپرواہ ہو کر تخلیق شعر میں مصروف ہیں، میرے دل میں اُن کے لئے جگہ پیدا ہو گئی تھی،

کچھ برسوں کے بعد مجھے کسی کام سے علی گڈھ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کے ادیبوں نے جس کشمیری شاعر کا تعظیماً ذکر کیا، وہ شوریدہ کاشمیری تھے، شوریدہ صاحب اُن ایام میں علی گڈھ میں تصوف کے موضوع پر ریسرچ کر رہے تھے، یہ دیکھکر مجھے خوشی ہوئی کہ علی گڈھ کے ادبی حلقوں میں انہوں نے ایک خوشگوار تاثر قائم کیا ہے، اور جب پروفیسر آل احمد سرور کا کشمیر یونیورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ناظم کی حیثیت سے تقرر ہوا، تو اپنے کشمیر کے احباب میں وہ شوریدہ صاحب کا احترام سے ذکر کرتے رہے، وہ انسٹی ٹیوٹ کے ہر ادبی اجلاس میں اُن کو مدعو کرتے

رہے، اور وہ برابر ہر سیمنار میں شرکت کرتے رہے، علامہ اقبالؒ سے اُن کو خاص عقیدت تھی وہ اُن کے کلام سے گہرے طور پر متاثر تھے، یہ اثرات اُن کے کلام میں بھی جلوہ گر ہیں،

ایک بار شوپیاں (پنجورہ) میں عزیزی محمد مقبول خان، جو ہم دونوں کے قریبی رشتہ دار ہیں، کے دولتکدے پر اُن سے ملاقات ہوئی، اور دیر تک باہمی گفتگو رہی، اُن کی شخصیت کے کئی دلاویز نقوش روشن ہوتے گئے، اُن کی مستقل سنجیدگی، شرافت نفس، کم آمیزی اور کم سخنی اُن کی شخصیت کے بنیادی عناصر تھے، اُن کا کلاسیکی اُردو شاعری، مذہبیات اور اقبالیات کا مطالعہ خاصا وسیع تھا، اور عروض پر مہارت نامہ رکھتے تھے،

وہ مجھ سے مانوس ہوتے گئے، اور گاہے گاہے میرے پاس جواہر نگر آتے رہے، میں اُن دنوں جواہر نگر میں مقیم تھا، وہ جب بھی آتے، تو فوراً واپس جانے کی بات کرتے ؎

ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

عموماً اُن کے چہرے پر تھکن کے آثار ہوتے اور لباس گرد آلود ہوتا، جیسے وہ میلوں پیدل چل کر آتے ہوں، اُن دنوں وہ طویل مقدمہ بازیوں کے چکر میں تھے، اور لوگوں کی بے ایمانیوں کا رونا روتے، لیکن انہوں نے شکست قبول نہیں کی تھی،

میرا دوسرا شعری مجموعہ "نایافت" شایع ہوا، میں نے کتاب کی ایک جلد اُن کو دی، چونکہ شوریدہ صاحب کلاسیکی رنگ سخن کے رسیا تھے، اور میں جدید شعری رویے سے منسلک تھا، اِسی لئے میرا خیال تھا کہ وہ میری کتاب کو طاق نسیان پر جگہ دینگے، لیکن میری جرأت کی حد نہ رہی، جب مجموعے پر اُن کا ایک طویل تنقیدی تبصرہ اسلام آباد کے ایک ادبی جریدے میں شایع ہوا، شوریدہ صاحب ادب کے تغیر پذیر رجحانات سے ناآشنا نہ تھے، تاہم نئی شاعری کے ابہام کے وہ شاکی ضرور تھے،

اقبال پر میری ایک کتاب "اقبال اور غالب" شایع ہوئی، تو اُنہوں نے ایک مکتوب میں ۲۷، نومبر ۱۹۷۸ء کو مجھے لکھا :

"آپ کی کتاب اقبال اور غالب کا مطالعہ پرسوں
ایک ہفتے کے اندر ختم کیا، آپ نے انگریزی ادب کے
توسط سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، اور اِن دو عظیم شاعروں
کے تخلیقی عمل کو نئے زاویے سے اپنے طور پر دیکھا ہے،
واقعی یہ ایک کارنامہ ہے، میں آپ کو قدرت بیاں
اور شگفتہ تنقیدی اسلوب پر مبارک باد دیتا ہوں"

عزیزی ڈاکٹر بشیر احمد نحوی نے ایک روز یہ اطلاع دی کہ شوریدہ صاحب اقبال اکاڈمی کے چیئرمین منتخب ہوئے ہیں۔ تو مجھے دلی اطمینان ہوا، شوریدہ صاحب اس عزت افزائی کے حقدار تھے، اِس لئے کہ اُنہوں نے اپنی ساری عمر شعر و ادب کی توسیع کے لئے وقف کر لی تھی، اور پھر وہ اقبال کے سچے شیدائی تھے، جب بھی اقبال اکاڈمی کا کوئی ادبی اجلاس منعقد ہوتا، تو وہ وقت پر بہ نفس نفیس موجود ہوتے ہوئے، اور اقبال دوستی کا ثبوت دیتے!

شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے میں نے اِس بات کی جانب توجہ کی کہ کشمیر کے مقتدر اور معروف اہل قلم اور صاحب کمال بزرگوں کو بزم ادب میں مدعو کیا جائے، تاکہ وہ اپنی حیات اور ادبی کارکردگیوں پر روشنی ڈالیں، شوریدہ صاحب کو عزت و احترام سے بلانے کی ذمہ داری نحوی صاحب کو سونپی گئی، شوریدہ صاحب وقت سے پہلے ہی تشریف لائے، اُن کے چہرے پر طمانیت کا نور تھا، انہوں نے اپنی ادبی زندگی کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے معاصرین، ادبی رویوں اور ماقبل کے ادوار کی ادبی مجالس اور شخصیات کا بھرپور تعارف کروایا، مجھے محسوس ہوا کہ وہ علم و ادب کا ایک خزانہ ہیں، میں نے اُن سے گزارش کی کہ وہ وقتاً فوقتاً طلبہ کو لیکچر دیں، جسے اُنہوں نے فراخدلی سے قبول کیا۔

اُن کی گرانقدر علمی و ادبی کارگزاریوں کے پیش نظر میں نے اپنی نگرانی میں ایک ریسرچ سکالر کو اُن پر ریسرچ کا کام سونپ دیا۔ اور نحوی صاحب سے کہا کہ وہ شوریدہ صاحب

سے اِس ضمن میں رابطہ قائم رکھیں، شوریدہ صاحب نے یہ سنا تو بہت خوش ہوئے اور مجھے ایک منظوم خط لکھا، جو کاغذات میں کہیں رہ گیا ہے،

کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے میں دلی طور پر چاہتا ہوں کہ کشمیر میں علم و ادب اور تہذیب و تمدن کی اعلیٰ اقدار کے فروغ کے لئے یونیورسٹی کو ایک کارگر اور فعال ادارہ بناؤں، اِس ضمن میں میں نے طے کیا ہے کہ کشمیر کے علم و ادب سے تعلق رکھنے والے صاحب کمال حضرات کو یونیورسٹی سے وابستہ کروں تاکہ وہ اپنے اپنے شعبوں میں تحقیقی کام کریں، اور اُن کی قدر افزائی بھی ہو، اِن بزرگوں میں پروفیسر شوریدہ کاشمیری بھی شامل تھے، اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی موصوف اپنی قلندرانہ لاتعلقی اور بے نیازی کو برقرار رکھ کر رخصت ہو گئے، اور یہ حسرت میرے دل میں رہ گئی کہ میں اُن کی قدر افزائی کے اہل نہ ہو سکا ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

شوریدہ صاحب اپنی قیمتی تصانیف اور شاعرانہ قدر و قیمت کی بنا پر ہمیشہ زندہ رہیں گے، وہ اردو کے ایک پختہ مشق شاعر تھے، داخلیت پسندی کے باوجود چشم وا رکھتے تھے، گرد و پیش کی سیاسی اور سماجی زندگی میں انتشار، لوٹ کھسوٹ اور اونچ نیچ سے متنفر تھے، انسانی اور روحانی اقدار کی پامالی اور بے حرمتی کے شکوہ سنج تھے، وہ تمام عمر اپنے داخلی واردات اور مشاہدات کو بے کم و کاست رقم کرتے رہے، اور فنی لوازم کا احترام کرتے رہے، انہوں نے تمام عمر فکر شعر میں صرف کر کے کشمیر کو وقار اور عزت عطا کی ہے، اور آج جبکہ وہ دنیا سے اٹھ گئے، تو اُن کے گھر میں اُن کے بے سہارا، کمسن اور یتیم بچے اشکبار آنکھوں سے سوال کر رہے ہیں کہ تمام عمر حرف و سخن کی خون جگر سے آبیاری کرنے کے بعد اُن کے ابنائے وطن نے اُن کے ابّو کے لئے کیا کیا؟

ہم اپنے باکمال بزرگوں کی عزت کرنا کب سیکھیں گے؟

ریاست کے ادبی اور تمدنی اداروں کے اِرباب اختیار خاموش کیوں ہیں؟ ٭

پروفیسر مرغوب بانہالی

کِتنا دِلسوز ہَے یہ شوریدہ ؟

کشمیر کے ایک دردمند اِنسان، ایک نیک دل اُستاد، ایک شریفُ النفس عالم اور ایک سلیم الطبع شاعر کی حیثیت سے مرحوم شوریدہ کشمیری کا شمار اُن صفِ اول کے کشمیری نژاد تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے کشمیر میں رہ کر اردُو زبان کی نزاکتوں اور اردُو شاعری کی باریکیوں تک نہ صرف رسائی پائی ہے بلکہ اِن دونوں باتوں میں اُستادانہ مہارت کا ثبوت بھی بہم پہنچایا ہے۔ اپنی خصوصیات کے پیشِ نظر شوریدہ صاحب اور اُن کے غ، م، طاؤس، رسا، جاودانی اور غلام قادر شہزور جیسے کئی ہم عصر شاعروں کی حیات اور کارناموں کو کشمیر یونیورسٹی میں اس قابل گردانا گیا ہے کہ ان پر حال ہی میں ایم فل سطح کے تحقیقی مقالے لکھائے گئے ہیں۔ البتہ ابھی شوریدہ صاحب کے شایانِ شان کوئی یادگار قائم کئے جانے کا اقدام نہیں کیا گیا ہے۔ اسلئے میں اپنی اس بات چیت کے آغاز میں ہی یہاں شوریدہ صاحب کے نام سے منسوب شوریدہ فلاح المسلمین لائبریری نام کا ایک بڑے پیمانے کا دارالمطالعہ قایم کرنے کی تجویز پیش کرتا ہوں اور اُس کے لئے میں اپنے ذاتی کُتب خانے اور اپنے شعبے کی کئی درجن کتابیں

بہم کرنے کی یقین دہانی کرتا ہوں۔

شوریدہ صاحب کے مومنانہ کردار، عالمانہ تبحّر اور فنکارانہ خلوص کا اندازہ آپکی دو شعری تصانیف کے علاوہ آپکے خطوط پر مشتمل "خطابِ خامہ" نام کی کتاب پڑھ کر بھی بخوبی ہو جاتا ہے۔

میں شوریدہ مرحوم کے ساتھ اپنے دوستانہ مراسم قائم ہو جانے کی ابتداء کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے خطابِ خامہ کے ایک اِقتباس کی روشنی میں ہی اُس جوہر قابل اور مردِ قلندر کے چند امتیازی اوصاف کو اُبھارنا چاہوں گا۔ میری مُراد ایسے اوصاف سے ہے جن کے پیدا ہو جانے سے ایک عالم کو عالِم باعمل کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور جنکی بدولت ایک شاعر کو یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗن کی سِفلی سطح سے اوپر اُٹھ کر اِلّا الَّذِیْنَ اٰمنوُ کے درجۂ اعلیٰ علیین میں پہنچنے کی سعادت نصیب ہو جاتی ہے۔

ایسے اوصاف مثلاً ایک جیّد عالم ہونے کے باوصف طالبِ علمانہ ذوق و تجسّس قائم رکھنا، یا رزمِ حق و باطل میں فولاد ثابت ہو جانے کے باوصف حلقۂ احباب میں ابر لشیم جیسی نرمی اختیار کرنا، یا صف اول کے دانشوروں میں شامل ہو جانے کے باوصف اپنی دینداری اور دین پسندی پر فخر محسوس کرنا، یا اُستادانہ فضیلت حاصل ہو جانے کے باوصف اپنے سے کم عمر ساتھیوں کی صلاحیت کا کھُلے دل سے اعتراف کرنا یا انُ کے کسی مشورے کو کھلے دل سے قبول کرنا۔ اِن تمام اوصاف کی ایک جھلک دکھانے کے لئے میں اب شوریدہ مرحوم کی شخصیت کی آئینہ داری کرنے والا مطلوبہ اقتباس پیش کرتا ہوں۔

یہ اِقتباس ۱۲، جنوری ۱۹۶۳ عیسوی کے روز پروفیسر حامدی کاشمیری کے نام لکھے گئے خط کا اِفتتاحیہ ہے۔ یاد رہے کہ ۱۹۶۳ء میں حامدی صاحب ایس، پی، کالج کے ایک بھولے بھالے سے نوجوان لیکچرار تھے اور کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ آیندہ برسوں میں برصغیر کے ایک مایہ ناز نقاد اور شاعر بن کر اُبھریں گے لیکن شوریدہ مرحوم نے ایسی عُقابی نظر پائی تھی جس کی بدولت وہ آج سے تین دہائیاں پہلے نہ صرف حامدی کی امید افزا صلاحیتوں کا اعتراف

کرتے ہیں بلکہ اُن کے برخوردارانہ مشوروں کی پذیرائی کر کے اپنی عالمانہ انکساری کا بھی مُظاہرہ کرتے ہیں۔ دوسری جانب شوریدہ صاحب اِس خط میں اور باتوں کے علاوہ اپنی ذاتی دردمندی اور اپنی بستی کے حصے میں آئی ہوئی غیر یقینیت کے امتزاج سے تخلیق ہونے والے اشعار کے پس منظر کی نشاندہی کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں اور اُن ہی اشعار کے تعلق سے وہ حامدی صاحب سے جرأتِ رندانہ کے متقاضی ہو جاتے ہیں، ملاحظہ فرمایئے اِن ساری باتوں کا عکس مکتوبِ شوریدہ کے مطلوبہ اقتباس میں، لکھتے ہیں۔

"بھائی حامدی، دُعائے کامرانی!

آج پہلی بار احتجاجاً زبانِ قلم کھول رہا ہوں۔ ایس، پی کالج سرینگر کے میگزین "پرتاب" برائے ۶۰ عیسوی میں، جس کے آپ نگران رہ چکے ہیں، میری ایک غزل بہ مطلع

؎ یا الٰہی بہار کب آئے دِل جلوں کو قرار کب آئے

کالج اسٹوڈنٹ محمد سلطان صوفی کے نام چھپ گئی ہے۔ کیا ایک طالبِ علم سے ایسی غزل کی اُمید کی جا سکتی ہے؟ آپ نے کہیں کہیں اِصلاح بھی دی ہے۔ ایک شعر ہے

؎ ہے جو برسوں سے آنکھ سے اوجھل وہ بداماں بہار کب آئے

آپ نے (اِس شعر کے) مِصرعۂ اُخریٰ کو یوں لکھا ہے "اب وہ جانِ بہار کب آئے

بیشک "جانِ بہار" ایک اچھی ترکیب ہے۔ مگر دامن کی ہوا کی رعایت سے کیا "بداماں بہار" کا اِستعمال برمحل نہیں؟ پھر بھی اِس اصلاح کے لئے میں بہت شکر گذار ہوں جو آپ نے بے خبری کے عالم میں دی ہے۔ غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

ہیں یہ زاغ وزغن کریہہ الصوت بلبلِ نغمہ بار کب آئے؟

اِس شعر کے مِصرعۂ اُولیٰ کو بدل کر آپ نے یہ بنا دیا ہے ؎

دِل کی وادی میں اُف یہ سناٹا بلبلِ نغمہ بار کب آئے

اور اس سے بہت پہلے میں نے اس مِصرعہ کو خود یوں بدل دیا تھا ع غنچہ غنچہ کی آنکھ ہو بیدار.....

آپ نے جو گرہ لگائی ہے وہ بھی خوب ہے۔ لیکن اس سے شعر غم ذاتی تک محدود ہو گیا ہے۔ حالانکہ میرے شعر میں خصوصاً اسکی دوسری صورت میں غم دوران کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یعنی یہ ایک اجتماعی آرزو کا اظہار ہے۔ (پھر) مندرجہ ذیل دو شعروں کو تو آپ نے قلم انداز ہی کیا ہے۔

؎ جو خزاں کو بہار کہتے ہیں — اُن پہ اب اعتبار کب آئے؟
دہر ہے بیقرار شوریدہ — کہتے ہیں سب بہار کب آئے؟

اگر آپ ان شعروں کو بھی شایع کرتے تو میں جانتا کہ آپ نے جرأت رندانہ سے کام لیا ہے"۔ حامدی سے جرأت رندانہ کا تقاضا کر کے شوریدہ صاحب نے اپنے عزیز ساتھی کو دراصل شاعرانہ سطح پر افضل الجہادِ کلمۃ الحق عِنْدَ السُّلطانِ الْجائِر کی سعادت میں شریک کرنا چاہا ہے اور یوں اس ایک اقتباس میں شوریدہ مرحوم نے اپنی شخصیت کے کئی گوشے روشن کر لئے ہیں۔ شوریدہ صاحب کی دیگر نگارشات بھی اس طرح کی ان گنت بوقلمونیاں چشمِ تخیل کے سامنے لے آتی ہیں۔ یکے بعد دیگرے ملک، فلاح اور شوریدہ تخلص کرنے والے اُس بزرگ شاعر سے وابستہ کئی دلچسپ باتیں اِس وقت میرے ذہن میں منڈلا رہی ہیں۔ خاص طور پر اس ضمن میں کہ سیدھی سادھی اور بھولی بھالی طبیعت والے اس بزرگوار میں کیسی ایمانی بصیرت اور فراست پائی جاتی تھی۔ لیکن میں ایسی توصیفی باتوں سے احتراز کر کے وقت کی تنگ دامانی کو ملحوظ رکھکر صرف ایک ایسے حسنِ اتفاق اور حسنِ اشتراک کی یاد تازہ کرنے پر اکتفا کروں گا، جو ہم میں باہمی احترام کا باعث بنا تھا۔ وہ ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء کا زمانہ تھا جب اسلام آباد کالج میں زیرِ تعلیم باہنال کے محمد حسین نامی ایک طالبِ علم کے ذریعے مجھ تک شوریدہ مرحوم کی ایک اردو نظم "ہنگام شام" پہنچی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ اُسی آہنگ اور اُسی بحر میں تخلیق ہو گئی تھی جس میں رات سے متعلق میری ایک کشمیری نظم وجود میں آگئی تھی۔ اگر ہم دو شاعروں میں اُس سے پہلے کچھ مراسم رہے ہوتے تو ممکن تھا کہ ہم بھی یہ سوچتے کہ ہو سکتا ہے ایک دوسرے سے متاثر ہو کر ہم نے یوں

طبع آزمائی کی ہے۔ مناظرِ فطرت سے متعلق شوریدہ صاحب کی یہ تخلیق جس طرح اُنکی ابتدائی دور کی نظموں میں شامل تھی اُسی طرح سے میری نظم بھی بالکل میری ابتدائی دور کی تخلیق تھی۔ بہر حال ایک گونہ مشابہت دیکھ کر میں نے جسارت سے کام لیا بلکہ ایک گونہ گستاخی کا ارتکاب کیا۔ جب اُنہیں اپنی کشمیری نظم تخفتاً بھیج کر تمہیداً یہ بھی لکھدیا کہ میں نے آپ کے برعکس شام اور شب کے ورود سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اللہ پاک نے جس طرح سے موسم بہار کی شکل میں غافل انسانوں کے لئے کڑک اور بجلیوں والی محشر نمائی کے ایک سالانہ ریہرسل کا اہتمام فرمار کھا ہے۔ اُسی طرح سے مومنوں کے ایمان کو تقویت بہم پہنچانے کے لئے رات کی شکل میں خاموش محشر نمائی کے روزانہ ریہرسل کا ایک یاد دہانی کرنے والا سلسلہ بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ اس ناطے سے میری نظم کا عنوان "محشر نمائی ہُندروزانہ روٹین ریہرسل" آپ کو کیسا لگے گا؛ ظاہر ہے کہ اس طرح کے کلمات لکھ کر میں نے چھوٹے منہ سے بڑی بات کہنے کا ارتکاب بلکہ شاعرانہ خود نمائی کا ارتکاب کیا تھا۔ لیکن شوریدہ مرحوم کا بڑا پن دیکھیئے کہ انہوں نے نہ صرف میرے اظہار کو خوب سراہا تھا بلکہ اس کو مناظرِ فطرت سے مُومنانہ استنتاج کا نام بھی دے دیا تھا اور یوں ہم پہلی بار ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے یوم وصال اور یومِ شوریدہ کے اتصال کی اِس یادگار تقریب میں دو ہم مشرب اور ہم نظریہ شاعروں کی دو مشابہ نظمیں دو زبانوں میں سننے کا موقع معزز سامعین کو بھی بہم پہنچایا جائے۔ پہلے شوریدہ مرحوم کی چھ شعروں پر مشتمل مذکورہ نظم پیش ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اس کا عنوان ہنگامِ شام ہے۔ سُنیئے:

غُرفۂ مغرب میں داخل ہو گیا ہے آفتاب
بسترِ نور شفق میں سو گیا ہے آفتاب

نور و ظلمت میں ہُوا جاتا ہے پیدا اتصال
ہے روا فطرت میں باہم گورے کالے کا وصال

ملگجے کپڑے میں ہے ملبوس اِس دم کائنات
مفلسوں میں کر رہی ہے شرکتِ غم کائنات

دیکھ لو وہ جل رہے ہیں کس طرح گھر گھر چراغ
میرے سینے میں بھی روشن ہو رہا ہے داغ داغ

آ گئے مزدور و دہقاں کارگاہوں سے تمام — ہے اُنہیں مرغوبِ خاطر دعوتِ ہنگامِ شام
آ گئی لیلائے شب نشہ پلانے کے لئے — سایۂ گیسوں میں دُنیا کو سُلانے کے لئے

اب شوریدہ صاحب کے حق میں دعائے مغفرت مانگتے ہوئے ایک بار اُن کو تحفتاً بھیجی ہوئی اپنی مذکورہ نظم بھی سُناتا ہوں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا میری اِس کشمیری غزل نما نظم کا لمبا سا عنوان ہے:

"محشر نُمایی ہُند روزانہ روتلی ریہرسل"

اور اِس کا متن یوں ہے:

نظرِ تا پکُ شاپھ ژوّل نوّن گونیس رازِ حیات — چھایہ محشر؛ گاشر ولُب زندگی بعد از ممات
ژھیتہٕ گژِ تھ روشن کران سیر شامِ یُس تارکھ نیس — مرنہٕ پتہٕ روٗحن تہٕ جسمن تلہٕ سُہ تھوٚد از التفات
آفتابُک ٹھوٚر ژلتھ وٚدتھ ٹھان تھوٚد کیتن سرن — کشہٕرہ ناقص، نارساتے نابلد اسہٕ اُچھ؛ نجات
حرفِ غلطکی پاٹھی کمی ہنو در نگن ہُند تمیز — نقشِ باطل کورٕ شبن ثابت نظامِ ذات پات
کرُہنہٕ آگر پُچھنہٕ پکھتل روٚٹ خدا صابن عیال — ہتھہٕ ننس زگتس تہٕ دژ روتلی کرِ ہنی ژاورِ زکات
نندرِ موکل سونچہ ژانگن گولوتی ہٹی چیر دتھ — کرُ دُنیٕ ری عاشقن روشن یقینچ کائنات
مُنتشر ذہن جمع یُس نندرِ پتہٕ پرُتھ حس کران — مُنتشر تانن بہ محشر سو مبرِ سُی بے مُشکلات
فائنین ہشنز تھچہ گژھان ڈبج یام انسانی دِس — تام بقہٕک گاش ہاوان تتھ چھہٕ روٗحانی صفات
شور شہرک ییلہ ژھو کان تیلہٕ پتھ وچ کول کتھ کران — زلو شورٕچ کلمہٕ پوٚر تحتُ الثَّورٰن اسمِ ذات
پوٚت ثبک پلترن چھُ نظرن شولنا دان شش جہات — لوٚب امی ظُلماتہٕ مرغوٗبن دُلکِ آبِ حیات

اِن الفاظ اور اشعار کے ساتھ شوریدہ صاحب کی ایک حسین یاد تازہ کر کے میں پھر ایک بار دست بدعا ہوں کہ اللہ پاک اُن کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور گذشتہ سال کے دوران رحلت کرنے والے تمام صلحا اور شہداء کا درجہ ربُ العزّت بلند فرمائے۔ آمین ؛

ڈاکٹر بشیر احمد نحوی

پروفیسر شوریدہ کاشمیری

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

میں نے گذشتہ پندرہ برسوں میں ریاست کے بلند پایہ عالموں، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، دانشوروں اور مقرروں میں سے اکثر و بیشتر کو قریب سے دیکھا اور قریب سے سنا ہے، اس لئے کہ دس سال تک الکٹرانک میڈیا کے ساتھ میرا براہِ راست تعلق رہا۔ ان میں سے چند حضرات میرے لئے رہبر و رہنما کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کے فیضِ صحبت اور فیضانِ نظر سے میں کبھی اغماض نہیں برت سکتا ہوں۔ انہی شخصیات میں وادی کے مقتدر اردو شاعر اور استاد جناب شوریدہ کاشمیری ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ شوریدہ کاشمیری کی ذاتِ گرامی کے ساتھ میرا گہرا قلبی لگاؤ تھا، چنانچہ جب کبھی مجھے اسلام آباد کسی دوست یا رشتہ دار کے ہاں جانا ہوتا تھا تو لازماً نئی بستی میں انکی رہایش گاہ پر کبھی چند منٹ اور کبھی چند گھنٹے حاضری دیکر مسرت و طمانیت کی بیش بہا دولت کے ساتھ واپس لوٹتا تھا۔ مرحوم کے ساتھ اپنے پندرہ سالہ تعلقات کو ضبطِ تحریر میں لانا میرے لئے نہایت دشوار ہے۔ تاہم چند تاثرات اور واقعات کی روشنی

میں اُستادِ محترم جناب شوریدہ کاشمیری کے تئیں خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

شوریدہ کاشمیری کے ساتھ میرا پہلا تعارف ان دنوں ہوا جب میں ڈگری کالج اسلام آباد میں زیر تعلیم تھا اور شوریدہ کاشمیری بی۔ اے پریویس کی اردو کلاس لیا کرتے تھے۔ اولاً میں نے ان کے بارے میں یہ تاثر قائم کیا کہ وہ ایک خود فراموش قسم کے انسان ہیں لیکن اردو شعر و ادب پر انکی گہری نظر سے آہستہ آہستہ میں مرعوب ہوتا گیا۔ کالج میں آئے دن مشاعرے اور مباحثے ہوا کرتے تھے۔ شوریدہ صاحب ہمیشہ ان محفلوں میں پیش پیش رہتے اور کبھی مشاعروں کی صدارت اور کبھی مباحثوں میں اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مذاکرات میں مجھ خاکسار کو دعوت سخن دیتے وقت آتش بیان، شعلہ نوا وغیرہ الفاظ والقاب استعمال کر کے ناچیز کی زبردست حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کالج میگزین کی ادارت کا معاملہ سامنے آیا تو فوراً میرا نام تجویز کیا۔ انٹر کالج مباحثوں کے مقابلے میں میرے نام کا انتخاب کرتے۔ غرض قدم قدم پر بے پناہ شفقت اور فراخدلی کا مظاہرہ کر کے میری فکر و نظر کی راہوں کو کشادگی بخشتے تھے۔

اوپر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ٹی۔ وی کے ساتھ میرا براہِ راست تعلق تھا اور وادی کے بیشتر ادیبوں، اور شاعروں کو نزدیک سے دیکھنے، سمجھنے اور سننے کا موقعہ فراہم ہوتا تھا۔ ان ادیبوں میں چند اصحاب ایسے بھی تھے جو ریڈیو اور ٹی۔ وی پر دو سو روپے تین سو روپے یا پانچ سو روپے کے عوض اپنے فکر و فن سے کھُل کھیلا کرتے تھے۔ شوریدہ کاشمیری نے کبھی بھی ٹی۔ وی کے کسی پروگرام آفیسر جو "دھنک" "ہم قلم" "کلام شاعر" یا "تار کھ مال" پروگرام ترتیب دیتے تھے یہ درخواست نہیں کی کہ انہیں پروگرام میں شامل کیا جائے۔ کبھی ۲ سو روپے کی خاطر عاجزی و انکساری کا اظہار نہیں کیا اور اس طرح اپنی شاعرانہ اور قلندرانہ غیرت کو پامال ہونے نہیں دیا۔ ٹی۔ وی میں اپنے شاگردوں کو کبھی اپروچ

نہیں کیا اور دس سال تک زبان پر یہ نہیں لایا کہ آپ ٹی۔ وی میں ملازم ہیں، لہٰذا میرا انٹرویو لیا جائے اور کلام ریکارڈ کرا کے میرے نام کی خوب تشہیر ہو، اور مجھے مادی فائدہ بھی حاصل ہو ——— میں از خود ہی کبھی کسی پروگرام میں آنے کی عرضداشت کرتا یا کسی پروڈیوسر سے استدعا کر کے انہیں پروگرام میں شامل کراتا تب آپ ٹی۔ وی تشریف لاتے تھے۔ یہ بے نیازی، اور شہرت و ناموری سے کنارہ کشی کا عالم تھا اور اسطرح ہر معاملے میں آپ استغنا، غیرت اور حمیّت اسلامی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اقبال نے اسی لیے کہا تھا،

عمر کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

شوریدہ صاحب کی اور ایک اہم صفت یہ تھی کہ وہ حاکمانِ وقت کے درباروں میں جانے سے احتراز کرتے تھے۔ اور اگر کبھی مجبوراً کسی کام کے لیے جانا ہی پڑتا تو بکراہت ——— جاتے۔ جناب حکیم منظور کا یہ شعر ان پر ٹھیک ٹھیک صادق آتا ہے۔

مجھ کو سب منظور ہے کوئی مجھے لکھے، مگر
حاکمانِ شہر کا دریوزہ گر لکھے نہیں

امیروں، نو دولتیوں، ریڈیو اور ٹی۔ وی کے منتظموں کے پاس اپنے فکر و فن کو گروی رکھنا شوریدہ صاحب گناہ تصور کرتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اسلام کا دوسرا نام فقر غیور ہے۔ فقرِ غیور کی یہ صفت آپ کے کلام میں جا بہ جا نظر آتی ہے۔ مرحوم بخشی غلام محمد کم تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بڑے سخن سنج اور ادب نواز تھے۔ اپنے دورِ اقتدار میں انہوں نے کئی مشاعروں کا انعقاد کرایا تھا اور خود مختلف علاقوں میں جا کر ادبی، ثقافتی اور تمدنی سرگرمیوں میں شریک ہو جاتے تھے۔ ایک بار بخشی صاحب شوپیاں گئے۔ قصیدہ خوان شاعر اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ بخشی صاحب کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اسٹیج پر ایک لانبے قد کا شخص نمودار ہوا

اور اپنا کلام سنانے لگا۔ یہ شخص شوریدہ تھا جو بخشی کی مطلق العنانی پر ایک قطعہ طنزیہ انداز میں سنا کر بخشی کو آتش زیر پا کرتا ہے۔

ے ووٹ بندوں سے کب لیا تو نے — خود کو خود ہی خدا کیا تو نے
طرفہ یہ مطلق العنانی ہے — سبکو اپنا بنا دیا تو نے

شوریدہ صاحب کا بیان ہے کہ بخشی غلام محمد یہ قطعہ سنکر غصہ میں آگیا اور اپنی حاضر جوابی کا ثبوت دیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ "بیٹھئے بیٹھئے سن لی تیری شوریدگی"

فقر غیور، حمیت، ظلم کے خلاف مقابلہ آرائی اور اپنے حق کی پاسداری کا شوریدہ کاشمیری کو زبردست حوصلہ تھا۔ اور اس سلسلے میں وہ کبھی مصلحت یا مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اپنے آبائی قریہ پنجورہ میں ۱۸ سال تک ایک قطعہ زمین پر بڑے بڑوں کے ساتھ نبرد آزما ہوئے۔ بستی کے بااثر لوگ ایک طرف اور دوسری طرف یہ نحیف و نزار لیکن حساس شاعر تن تنہا! — اُسے اپنی صداقت کا بھرپور احساس تھا اور کامیابی کی امید بھی، عدالت میں برسوں مقدمہ لٹکا رہا۔ اس واقعہ کو یوں قلمبند کیا ہے۔

ے خریدی جو تھوڑی سی میں نے زمین — تو اک پیر جی کو جنوں ہو گیا
کہا مجھ سے رقبہ مرا چھین کر — تو مشتاقِ دنیائے دوں ہو گیا
مگر جب ہوئی دو بدو قیل و قال — دُروں اس کا فوراً بروں ہو گیا
مریدوں نے کھسیانے ہو کر کہا — حقیقت کا اظہار کیوں ہو گیا
عدالت میں بھی ہو گئے شرمسار — وہاں حق کا اثبات یوں ہو گیا
اُٹھا جب کبھی کوئی حق کے خلاف — تو وہ سر اپھرا سرنگوں ہو گیا
دل اپنا ہے شوریدہ شیدائے حسن — مگر حق کی خاطر بھی خوں ہو گیا

شوریدہ کاشمیری جذباتی یا شاعرانہ قسم کے مسلمان نہیں بلکہ سچے اور شعوری معنوں میں مسلمان

تھے۔ اسلام کے نظام حیات کے ساتھ بے پناہ عقیدت رکھتے اور رسول پاکؐ کو امامِ آزادی تسلیم کرتے تھے۔ آپ کا شعر ہے۔

؎ وہ جس نے طوق و سلاسل سے کر دیا آزاد
وہ اُمّیٔ عربیؐ ہے امامِ آزادی

سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آپ نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ زیارت حرمین کا فریضہ تھا۔ ہوائی جہاز کے بجائے بحری راستے کے سفر کو ترجیح دی۔ میں نے عرض کی کہ بحری سفر تو کافی تھکا دینے والا ہے۔ فرمایا ؎

رہروانِ عشق را خستگیٔ راہ نیست

زیارت حرمین کے موقع پر انہوں نے جو نعتیہ غزل لکھی اس سے انکی حرمین کے ساتھ عقیدت مندی اور عشق رسولؐ کی کیفیت سامنے آتی ہے۔

؎ مکاں سے خدا کے مکاں جا رہا ہوں
میں مجذوب دارُالاماں جا رہا ہوں
جہاں نور برسے جہاں طورُ تر سے
جہاں اور ہی ہے جہاں جا رہا ہوں
بلاوا ہے حق اور محبوبِؐ حق کا
دِلا! میں کہاں سے کہاں جا رہا ہوں
فقیرانہ ہو وضع یا عاشقانہ
بدرگاہِ شاہِ شہاں جا رہا ہوں
وہاں سے میں شوریدہ سرشار لوٹوں
یہاں سے تو آتش بجاں جا رہا ہوں

مرحوم شوریدہ کاشمیری شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے مکتبۂ فکر سے ذہناً اور جسماً

وابستہ تھے۔ اقبالؔ کے سلسلے میں یونیورسٹی یا یونیورسٹی سے باہر کوئی تقریب ایسی نہیں جس میں مرحوم شامل نہ ہوتے چنانچہ ۱۴، اگست ۱۹۸۷ء کو سرینگر کے تاج ہوٹل میں شوریدہ کاشمیری اقبالؔ اکیڈیمی جموں و کشمیر کے باضابطہ صدر منتخب ہوئے۔ اقبال اکیڈیمی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ۲۱، اپریل ۹۱ء کو مرحوم کی رہائش گاہ پر ایک شاندار ادبی تقریب کا انعقاد کرایا۔ کاش شوریدہ صاحب کی زندگی میں ان کے گھر پر انکے افکار و کردار پر اس نوعیت کی محفل منعقد ہوتی، تو مرحوم مسرت و انبساط کی کیفیت برسوں محسوس کرتے، لیکن ہم سب قانونِ قدرت میں بندھے ہوئے ہیں۔ ہم میں بہتر اور کامیاب زندگی ان لوگوں کی ہے جو اپنے پیچھے اچھی یادوں کے نقوش چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

؎ اپنے پیچھے چھوڑ جاؤ اپنی یادوں کے نقوش
آنے والے قافلوں کے رہنما بن کر چلو

۔ ۔ ۔

ڈاکٹر قدوس جاوید

شوریدہ

— ایک شاعر

شاعری — اعلیٰ اور عمدہ شاعری، خارجی معانی و مفاہیم سے قطع نظر اپنے آپ میں ایسے ہزارہا اکتشاف طلب اسرار رکھتی ہے۔ جن کو بے نقاب کئے بغیر نہ تو شاعری کی تشفی بخش تفہیم ممکن ہے اور نہ ہی شاعری سے یک گونا حظ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر کے لیئے خارجی حالات ہی محرکات شعری کا کام کرتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تخلیقی اظہار کی منزل تک آکر تخلیق ان تمام خارجی حقایق و حالات یہاں تک کہ شاعر کے ذاتی نفسیاتی اور عصری انسلاکات تک کی حدود کو توڑتی ہوئی ایک لسانی وحدت کے طور پر آزاد اور قائم بالذات وجود کی صورت میں سامنے آتی ہے جس کی اپنی ایک منفرد، نادیدہ اور شاعرانہ حقیقت POETIC REALITY ہوتی ہے۔ اس طلسم کو بے نقاب کرنے، تخلیق کے اسرار کو منکشف کرنے کا ایک اہم ذریعہ۔ خارجی اسباب و علل کے تجزیئے کے علاوہ تخلیق کے لسانی در و بست کا جائزہ

بھی ہے۔

شاعر کے تخلیقی روّیے کے تعلق سے یہی بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ شاعر کو اپنی تخلیق کو ایک معیاری لسانی وحدت میں ڈھال کر آزاد اور قائم بالذات وجود بخشنے کے لئے دمِ اظہار تخلیق کے لسانی دروبست پر خاطر خواہ توجہ دینی پڑتی ہے۔ میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ اور فیضؔ اگر ہمارے بڑے شاعر ہیں تو اس لئے بھی کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں زبان کے تخلیقی استعمال پر بھی۔ شعوری یا لاشعوری طور پر ازحد توجہ دی ہے۔ ایسا اس لئے بھی کہ یہ تمام شعراء ذخیرہ الفاظ کے ایک وسیع و بیکراں سمندر کے غوّاص تھے۔ ان میں لفظ اور لفظ کے درمیان فرق کرنے کا سلیقہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کس پہلو اور کس مقام سے لفظ کا استعمال لفظ کو تخلیقی تجربے اور جمالیاتی حسن کا جزو بنا سکتا ہے۔ چنانچہ آج بھی کسی شاعر کی فنی عظمت کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی شاعری میں زبان کے تخلیقی اِستعمال اور بحیثیت مجموعی اسکی شاعری کے لسانی نظام کو کلید کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ خارجی حالات و حقایق اور شعوری نتائجِ فکر کے علاوہ بے نام تجریدی اور لاشعوری کیفیات کی ترسیل کا وسیلہ زبان ہی ہے۔

اس نقطہ نظر سے جب ہم شوریدہؔ کاشمیری کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو پہلی بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ شوریدہ میرؔ و غالبؔ یا اقبالؔ اور فیضؔ کے پائے کے شاعر تو ہرگز نہیں ہیں۔ لیکن اخترالایمان اور ناصر کاظمی کے ہم عصر اچھے شعرا میں ان کا شمار یقیناً کیا جاسکتا ہے۔ شوریدہؔ نے زبان کے تخلیقی استعمال اور طرز بیان کے باب میں غالبؔ، میرؔ اور اقبالؔ سے خوب خوب کسب فیض کیا ہے۔

جوشِ جنوں (۱۹۸۰ء) جذب دروں (۱۹۸۸ء) کے شاعر شوریدہ کاشمیری کے اعمال نامے میں غزلیں، نظمیں، رباعیات قطعات اور نعتیں سبھی کچھ ہیں ان کی تخلیقات رومانیت، انقلابیت، مذہب و اخلاق سیاست اور سماجی مسائل جیسے مختلف و متعدد موضوعات

کوشش کرتی ہیں۔ ان موضوعات کے بیان میں ان کے یہاں عموماً روایتی انداز ہی ملتا ہے۔ ہاں کہیں کہیں ان کا لہجہ اور تخلیقی رویہ عصر حاضر کے جدید شعراء سے میل کھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ دراصل شوریدہ کلاسیکی اردو شاعری کی روایات اور فن شاعری کی باریکیوں، اسکے اسرار و رموز اور اظہار و بیان کے محاسن و معائب سے پوری طرح آگاہ تھے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی دور جدید میں زندگی کے ہر شعبے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے سبب شعر و ادب میں بھی قدروں کی شکست و ریخت اور تعمیر و تشکیل پر بھی ان کی نظر تھی اور یہ اسی کا اثر ہے کہ ان کے یہاں قدیم و جدید ہر رنگ کے اشعار مل جاتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے۔:

عشق نے نیست کر دیا مجھکو — میں نے دنیا میں ہی عدم دیکھا
بزم میں جب چراغ ہوں روشن — نہ کرو آفتاب کی باتیں
ہر دم اس کا خیال آتا ہے — شوق کو کب زوال آتا ہے
میں وہاں ہوں نہیں معلوم جہاں — میں کہاں ہوں میرا کاشانہ کہاں
عشق صادق میں کس طرح کوئی — جینے مرنے میں امتیاز کرے
وہیں کعبہ سمجھ لیا جائے — دل ادا جس جگہ نماز کرے
اے صنم دیدار اپنا عام کر — دلبران دہر کو گمنام کر
مرے پُر درد نالے گونجتے ہیں آسمانوں میں — ترے جلووں کا ہنگامہ مری آہ و فغاں تک ہے

میر، غالب، اقبال، جگر اور حسرت کے اثر و نفوذ سے قطع نظر شوریدہ کے یہ اشعار کلاسیکی اردو شاعری کے سرمائے کا حصہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

شوریدہ کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں ان کا لہجہ عصر حاضر کے میانہ رو جدید شعراء کی طرح روایت سے منسلک ہوتے ہوئے بھی نیا نیا سا ہے۔ مثلاً۔

کیا جانے ہم خود بدلے ہیں یا دنیا ہی بدلی ہے
جانے پہچانے لوگوں میں بے گانے سے لگتے ہیں

زندگی جیسے ایک دریا ہے — ہم ہیں پانی کے بلبلوں کی طرح
ہے وہ شوریدہ ایک سنگتراش — اسکے دِل میں جو راہ کرتا ہے
کوئی طوفان سا ہے یہ طوفان — کہیں دریا ہے اب نہ ساحِل ہے
وہ بوڑھا عجب شعبدہ باز تھا — بالآخر شجر میں اٹکتا رہا
یہ آشیانے سبھی آندھیوں کی زد میں ہیں — پہاڑ کوئی یہاں اب چمن پناہ نہیں
ہماری بھی قسمت کی ریکھا ہے کیا — تمہاری جبیں کی شکن کی طرح
ہم ان منزلوں سے بھی گذرے ہیں یارو — جہاں دیکے دم، ہم سفر لوٹتے ہیں
گھر میں چھایا ہے ایک سناٹا — سوز دل کا دیا جلاتے ہیں

اس نوع کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی سوچ و فکر، لہجے اور تخلیقی روّیے کو ذرا اور فروغ دیتے تو ان کی اہمیت اور معنویت میں اور اضافہ ہوتا۔

شوریدہ کی غزلوں کی طرح نظمیں بھی توجہ طلب ہیں۔ جوش جنوں اور جذبِ دروں میں ۷۰ سے زائد نظمیں ملتی ہیں جو شعر و سخن، اردو، شہر ناموں، ہنگامی واقعات نفسیاتی حادثات، مناظر فطرت مذہبیات اور اخلاقیات سے متعلق ہیں۔ چند نظمیں حضور اکرمؐ کی شان میں بھی ہیں۔ کچھ نظمیں طنزیہ و مزاحیہ نوعیت کی ہیں۔ سنجیدہ نظموں میں بطور خاص ڈل کا منظر، نیرنگ زمستان، اقبال، چناروں کا قتل۔ طلبہ کا ترانہ، شاعری، دردمندوں سے، جوگی، آشوب سیاست، اور شہر تمنا، وغیرہ اچھی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں زبان، تشبیہات و استعارات کا استعمال قابل توجہ تخلیقی انداز میں ہوا ہے ان نظموں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کہ اگر شوریدہ کو ان کی ذاتی پریشانیاں نہ الجھاتیں، مصائب نے ان کے قدم نہ روکے ہوتے فرصت اور فارغ البالی کے لمحات میسّر آتے تو شوریدہ اردو کو اچھی نظمیں دے سکتے تھے۔ پھر بھی جوشِ جنوں اور جذبِ دروں کی بعض نظموں میں ایسے حِصّے مل جاتے ہیں جنہیں عمدہ نظم نگاری اور اچھی شاعری کے نمونے کہہ سکتے ہیں۔ چند ایک مثالیں دیکھئے۔

۱۔ جاگزیں ہے تہہ آب ماہ مبیں — فوج انجم بھی ہے جسکے زیر نگیں
عرش کی فرش پر جھک گئی ہے جبیں — فرش پہنچا ہے بالائے عرش بریں
جملہ آفاق زیر و زبر ہے یہاں
کوئی سرکش ہو تو وہ بھی سر ہے یہاں
(نظم۔ ڈل کا منظر۔ جوشِ جنوں ص ۱۵۱)

۲۔ وہ فقر اس کا کہ شان سکندرانہ لئے — وہ شان اسکی کہ فقر قلندرانہ لئے
حقائق انفس و آفاق میں تلاش کئے — حیات و موت کے اسرار تازہ فاش کئے
کلام کیا ہے کہ آئینہ دار قراں ہے — پیام کیا ہے نسیم بہار دوراں ہے
(نظم۔ اقبال۔ جذب دروں۔ ص ۱۲۳)

۳۔ جلوہ صد رنگ سے کس کے ہوا دِل نغمہ خواں
شوق بے قابو سے کس کے ہوگیا شعلہ فشاں
کیا بلائے جاں سمجھ لیں تم کو یا آرام جاں
بڑھ گئیں تم سے تو مِل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دِل کو شکیبا کر دیا
(جوشِ جنوں۔ ص ۱۴۶)

شوریدہ کاشمیری کی وہ نظمیں جو کشمیر کے باغات، جھیلوں، موسم اور عادات و اطوار سے متعلق ہیں۔ منظر نگاری اور محاکات نگاری کی اچھی مثالیں ہیں۔ ہر چند کہ ان نظموں میں سطحی جذبات اور خارجی مشاہدات کا بیان ہے لیکن ان مقامات پر جہاں مناظر، موسم اور حالات ان کے وجود کا حصّہ بن کر شاعرانہ حقیقت کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ وہاں شوریدہ کی شاعری بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ شوریدہ کی اس نوع کی نظموں میں ڈل کا منظر، ڈل اور چاند۔ نیرنگ زمستان، اب کے جاڑے کی پہلی برف۔ فغان کاشمر، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شوریدہ کاشمیری کے اعمال نامے میں نعتیں، رُباعیات اور قطعات بھی ہیں۔ نعتیں ضرورتاً لکھی گئی ہیں اور ان سے محض اُردو میں نعتیہ شاعری کی روایت کی پاسداری ہی ظاہر ہوتی ہے۔ حالانکہ اپنی غیر مطبوعہ تصنیف "کلمات نبوی" میں شوریدہ نے رسول مقبولؐ کی منتخبہ احادیث کو شاعری کے قالب میں ڈھال کر اپنے عاشق رسولؐ ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ پھر بھی جوش جنوں اور جذب دروں میں شامل ان کی نعتوں میں کوئی انفرادیت نہیں محض عقیدت کا اظہار ہے۔ دراصل نعت گوئی ہر کس و ناکس کے بس کی بات بھی نہیں۔ رسولِ مقبولؐ کی ذات اتنی عظیم ہے کہ ان کی عظمت کو سمجھ کر ان کے مرتبے کا خیال رکھتے ہوئے اظہار عقیدت کے لیئے بھی غیر معمولی علم، فضل، بصیرت اور شاعرانہ صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اور ظاہر ہے یہ ساری خوبیاں کم ہی لوگوں میں یکجا ہو پاتی ہیں اسی لئے روایتی انداز میں نعتیہ شاعری تو اکثر و بیشتر شعراء کر لیتے ہیں لیکن جس "شے کو نعت" کہتے ہیں اس کو نبھانے اور برتنے کی سعادت کم ہی لوگ حاصل کر پاتے ہیں۔ لہذا شوریدہ کاشمیری بھی اگر روایتی انداز میں ہی نعتیہ شاعری کے نمونے پیش کر پاتے ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

یہی حال ان کی رباعیات کا بھی ہے۔ لیکن شوریدہ کے قطعات توجہ طلب ہیں۔ بلکہ بعض قطعات تو اتنے معیاری اور معنی خیز ہیں کہ سوچنا پڑتا ہے کہ اگر شوریدہ نے صرف قطعات کہے ہوتے، یا خصوصیت کے ساتھ قطعات پر توجہ مرکوز کی ہوتی تو ان کا شاعرانہ مرتبہ کہیں زیادہ بلند ہوتا۔ چند قطعات ملاحظہ ہوں۔

ہمارا تو کہاں ہوتا ہے اے دِل — انہیں کے عشق میں کھوتا ہے اے دِل
بھلا اتنا بتا تو دے کہ پھر کیوں — ذرا سی چوٹ پر روتا ہے کیوں دِل

اُف یہ وسواس یہ شکوک یہ وہم — زہر ہیں زہر زندگی کے لئے
اُن سے یارب نجات دے ورنہ — موت بہتر ہے آدمی کے لئے

آج ہے عید الضحیٰ قربانیوں کی دھوم ہے
شان ابراہیم ہے یارب بہر سو آشکار
بے نواؤں کو کہاں مقدور قربانی مگر
ایک دل ہے اور سو بار اسکو کرتے ہیں نثار

اک نہ اک دن یہ آ ہی جائیگی موت سے کس لئے ڈرے کوئی
موت کے غم سے موت سے پہلے سینکڑوں بار کیوں مرے کوئی

شوریدہ کاشمیری کی شاعری کا ایک رنگ طنزیہ و مزاحیہ بھی ہے۔ حالانکہ کشمیر میں قاضی غلام محمد کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری ہندو پاک کے ہم عصر طنز و مزاح نگاروں کے معیار شاعری کو للکارتی نظر آتی ہے اور یقیناً شوریدہ کی طنزیہ شاعری اس پائے کی شاعری نہیں ہے۔ پھر بھی ان کے طنزیہ و مزاحیہ کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر شوریدہ اس جانب پوری سنجیدگی سے کرتے تو ان کا شمار آج ہندو پاک کے قابل ذکر طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا۔ شوریدہ کے مجموعہ کلام "جذبِ دروں" میں کا ایک حصہ مزاحیہ کلام پر ہی مشتمل ہے "مطائبات" کے عنوان کے تحت اس حصے میں مزاحیہ نظمیں، رُباعیات، قطعات اور غزلیں سبھی کچھ ہیں۔ عید گاہ میں دنگل، پبلک سروس کمیشن وغیرہ اچھی مزاحیہ نظمیں ہیں۔ اس طرح شوریدہ کاشمیری کے کلام کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوریدہ وادی کشمیر کے ایک ایسے اُردو شاعر ہیں جنہوں نے کم و بیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور جیسا کہ میں نے آغاز میں ہی کیا ہے۔ شوریدہ کی شاعری ایسی نہیں ہے جسے بڑی اور غیر معمولی شاعری قرار دیا جاسکے۔ لیکن ان کی شاعری میں ایسے عناصر کثرت سے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوریدہ کے یہاں تخلیقی قوت کی کمی نہیں۔ بعض مقامات پر زبان کا تخلیقی اِستعمال پوری فنکاری کے ساتھ ہوا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے شعر کو برتنے کا بھرپور سلیقہ بھی ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خارجی حالات و مشاہدات کو کس

طرح داخلی کیفیات و حسیات کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے شوریدہ ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ یوں بھی آج کے کسی بھی شاعر کو غالبؔ اور اقبالؔ کے معیار سخن سے پرکھا نہیں جاسکتا کیونکہ موجودہ دور عمومی طور پر اعلیٰ شعر و ادب کے لئے بانجھ ہی ثابت ہو رہا ہے۔ اس صارفینی دور (CONSUMER'S AGE) میں جبکہ لوگ ہر شے کو نفع و نقصان کی عینک سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں اگر کوئی شخص فکر سخن کرتا ہے تو قابل قدر ہے اور اسکے یہاں غنیمت شاعری کے بھی امکانات نظر آئیں تو ایسے شخص کی پذیرائی ہونی چاہیئے۔ شوریدہ تو بہر حال ایک اچھے اور ہنر مند شاعر ہیں جو اگر مسائل میں اُلجھائے نہ گئے ہوتے تو یقیناً عصر حاضر کے ایک اہم شاعر ہوتے ——— ●●

غلام نبی ھاگرو

قلندرانہ مزاج کا شاعر

—— غلام محمد ملک شوریدہ

سوموار ۲۲، رمضان ۱۴۱۱ھ (۸، اپریل ۱۹۹۱ء) علی الصباح غلام محمد ملک شوریدہ صدر ہسپتال سری نگر میں فوت ہوئے۔ اُس وقت اُن کے اردگرد اُن کے چند قریبی رشتہ دار حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔ وہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر اس دنیا سے چل بسے

شوریدہ صاحب کچھ عرصہ سے کمزور و ضعیف تھے اور ڈاکٹر صاحبان کے زیر علاج تھے۔ ڈاکٹر صاحبان کے مشوروں کے مطابق مُقوی غذا کھاتے تھے۔ اس سال جب روزے شروع ہوئے تو شوریدہ صاحب کی جان میں جیسے ایک جان پڑی۔ اور انہوں نے اپنی دیرینہ عادت کے مطابق روزے رکھنے شروع کئے۔ روزوں کے تیرویں دن جمعہ ۲۹، مارچ ۱۹۹۱ء کو بعد دوپہر سینہ میں اُن کو درد محسوس ہونے لگا اور اسی حالت میں اُن کو اسلام آباد کے سرکاری ہسپتال میں داخل کیا گیا ڈاکٹر صاحبان نے دوسرے دن اُن کو سرینگر کے صدر ہسپتال میں منتقل کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ صدر ہسپتال میں انٹین سیو کیر وارڈ میں اُن کو رکھا گیا۔ ایک ہفتہ وہاں زیر علاج رہے۔ مختلف ٹیسٹ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحبان نے اُن کو

"خطرہ سے باہر" قرار دیا اور اُن کے قریبی رشتہ داروں سے یہ بھی کہا کرو۔ شوریدہ صاحب کو اپنے گھر بھی لے سکتے ہیں۔ اُن کے قریبی رشتہ دار بھی محسوس کر رہے تھے کہ شوریدہ صاحب کی حالت بہت حوصلہ افزا ہے اور اتوار کے دن اور سوموار کی صبح تک یہ امید کئے ہوئے تھے کہ ہسپتال کے ڈاکٹر صاحبان جوں ہی دس بجے ہسپتال آکر انڈور بیماروں کا معاینہ کرینگے تو شوریدہ صاحب کو گھر لے جانے کی اجازت دینگے کیونکہ اب اُن کو علاج کی نہیں بلکہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ لیکن سوموار کی صبح نمودار ہوئی تو اسی کے ساتھ اُن کا پروانہ اجل بھی آگیا اور شوریدہ صاحب دارالعمل سے دارالحساب میں قدم رکھ گئے۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے اور بہ صدقِ دل عاجزی کے ساتھ دعا ہے کہ وہ شوریدہ صاحب کی مغفرت فرمائے اور اُن کو اپنے نیک بندوں میں جگہ دے۔

شوریدہ صاحب کی جدائی کی خبر سننے کے بعد میں اُن کے گھر گیا۔ اور اس دوران اُن کی چند یادیں حافظہ میں تازہ ہوگئیں جن کو میں یہاں بیان کر رہا ہوں۔

میں سکول میں ہی پڑھ رہا تھا کہ شوریدہ صاحب کا نام سُنا۔ اُن دنوں اُن کا ایک مصرعہ زبان زدِ خلائق (سکولوں اور کالجوں کی حد تک) ہوا تھا۔ مصرعہ یوں ہے۔

کیا خوب ملا بر سرِ بازار طمانچہ

مجھے شوریدہ صاحب کو پہلی بار اُس وقت دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ جب نواب بازار میں مغل مشاعرہ منعقد ہوئی میں کالج میں پڑھتا تھا اور شوریدہ صاحب نے اپنا کلام وہاں سنایا۔ انہوں نے وہاں چند اشعار سنائے۔ جن میں ایک شعر کا مطلب یہ تھا کہ پتلون کو پہنے ہوئے ہی میں نے نماز پڑھی اور کریز کے توڑنے کا خطرہ مول کر حکم خدا کی اطاعت کی۔ مجلس مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جو بھی وہاں سے چلا تو وہ شوریدہ صاحب کے یہ الفاظ دہرائے جا رہا تھا ؎

میں نے پتلوں کو مسلماں کر دیا .....

شوریدہ صاحب کے شعر کے یہ الفاظ اُس دور کی یادگار ہیں جب پتلون بہت تنگ ہوا کرتا تھا اور جس کی کریز قائم رکھنا بڑا مشکل تھا۔ اُس دور میں چھوٹے ملازم رات کے وقت اپنے پتلون بستر کے قرینے سے رکھتے تھے اور خود اِس پر سو جاتے تھے۔ اس طرح اس کی کریز ہو جاتی تھی۔ اونچے افسران سکنجے بھی اس کریز کے لئے بنائے تھے اور استری کا رواج بھی ہونے لگا تھا۔ لیکن روز روز کوئلے کی استری گرم کرنا بڑا مشکل کام تھا اور پھر قیمتی کپڑوں کو اس طرح کی استری کی اسے نکلنے والی چنگاریوں سے بچانا ایک کٹھن کام تھا۔ ان حالات میں پتلون کو مسلمان بنانا شوریدہ صاحب جیسے قلندر سے ہی ممکن ہو سکتا تھا۔

اس مشاعرہ کے بعد شوریدہ صاحب سے میرے قریبی تعلقات رہے جو اُن کی آخر عمر تک قائم رہے۔ شوریدہ صاحب پہلے گورنمنٹ سکول میں استاد تھے اور پھر لکچرار ہوئے اور اسلام آباد کے کالج میں اُن کی ڈیوٹی لگی۔ اب ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا روز کا معمول بن گیا۔ لیکن ابتدائی سالوں میں اُن کو یہ دقت پیش آتی تھی کہ کوٹ پتلون پہنے بغیر گھر سے باہر زیادہ دور تک نہ نکلتے تھے۔ اس کے برعکس اپنا حال تو دوسرا ہی تھا اور بہ محمد اللہ ہے۔ اس لئے وہ خال خال ہی آتے تھے جبکہ مجھے اکثر و بیشتر بلاتے رہتے تھے۔ ساٹھ کی دہائی کے ابتدائی سالوں کی بات ہے کہ موسم سرما میں پہلی برف باری ہوئی تو اُن کی طرف سے بلاوا آیا کہ شام کو اُن کے ہاں کھانا کھاؤں اور رات بھر اُن کے ہاں ہی رہوں۔ چنانچہ شام کو میں پہنچا تو تعجب ہوا کہ وہاں میرے علاوہ ایک بزرگ مہمان تھا۔ چٹ سفید داڑھی جو سلیقے سے سجی ہوئی تھی، سنبھالی ہوئی تھی۔ سر پر سفید عمامہ اور اعلیٰ کپڑے کا شفاف فیرن پہنے ہوئے جو بزرگ تھے وہ لسہ خان تھے۔ کشمیری زبان میں گل بکاولی کا مترجم۔ خود بھی شاعر اور وحدت الوجودی ــ فلسفہ کے زبردست حامی۔ اُن سے تعارف ہوا اور شرف ملاقات ابھی۔ اس سے قبل میں اُن کو نہ جانتا تھا۔ لیکن انہوں نے میرے والد مرحوم اور میرے دوسرے بزرگوں کے بارے میں

بہت کچھ بتایا۔ لسہ خان صاحب، شوریدہ صاحب اور میں نے کھانا کھایا۔ شوریدہ صاحب نے اس تقریب کے لئے کئی اچھے کھانا بنائے تھے اور کھانا کھانے کے بعد شوریدہ صاحب نے محترم لسہ خان صاحب سے اپنے پسندیدہ تصوف کے اصولوں کی وضاحت کرنے کی استدعا کی اور ساتھ ہی مجھے خبردار کیا میں نے محترم لسہ خان کی باتوں کا جواب دینا ہے۔ اس موقعہ پر شوریدہ صاحب نے بتایا کہ اسی، پیچیدہ موضوع کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی غرض سے اس محفل کو محدود رکھا۔ چنانچہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار روایتی کشمیری پوشاک بزرگ کی زبان سے فلسفۂ وحدت الوجود کی تشریح اور توضیح بڑے ہی خوبصورت انداز میں سُنی۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ میں نے اس سے قبل اسی موضوع پر برٹرینڈرسل کی کتابیں پڑھی تھیں اور ڈاکٹر میر ولی الدینؒ کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ قرآن مجید کی تفسیر اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھی تھیں۔ اس لئے میں نے فلسفہ وحدت الوجود پر ایمان بالرسالت کے نقطۂ نظر سے چند باتیں عرض کیں۔ مجلس رات بھر جاری رہی اور اذانِ صبح کے ساتھ ہی شوریدہ صاحب اور میں مسجد کو چلے اور محترم لسہ خان صاحب اپنے مکان، جو وہاں قریب ہی میں واقع تھا، تشریف لے گئے۔

بخشی غلام محمد وزیراعظم جموں و کشمیر، نے اپنے دورِ حکومت میں سماج کے مختلف طبقوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے قید و بند کا انسانیت سوز سلسلہ بھی جاری رکھا اور غنڈوں اچکوں اور لفنگوں کی ایک بڑی کھیپ بھی رکھی جو سیاسی مخالفین کو سرِ بازار پیٹا کرتے تھے، یا بازاروں سے اٹھا کر اپنے مخصوص اڈوں پر ان کو دہشت کا شکار بناتے تھے اور ادھر سے شاعروں ادیبوں اور دوسری طرح کے فنکاروں کو اپنے قریب لانے کے لئے اس نے حاتم طائے کی قبر پر لات ماری اور کئی بار ماری۔ مشاعرے ان دنوں علمی حلقوں تک ہی محدود نہ ہوتے تھے بلکہ وہاں بھی ہوتے تھے جہاں علم و ادب کی روشنی ان شاعروں کے انعقاد سے قبل نہ پڑی ہوتی تھی۔ ادھر اس دوران الیکشن ہمیشہ کی طرح برائے نام ہوتے

تھے اور اکثر و بیشتر بلا مقابلہ حکمران پارٹی کے امیدواروں کو کامیاب دیکر افسر لوگ اپنی سرکار نوازی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اسی ماحول میں ایک مشاعرے کے لیے شوریدہ صاحب کو بھی بلایا گیا تو شوریدہ صاحب کی جب باری آئی تو انہوں نے اپنا قطعہ سنایا۔ ؎

خود کو خود ہی خدا بنا دیا تُو نے
ووٹ بندوں سے کب لیا تُو نے

جوں ہی آپ نے یہ شعر پڑھا کہ میر مجلس بخشی غلام محمد کے اشارے پر شوریدہ صاحب کو بٹھوایا گیا ـــ بہت سارے ادیب و شاعر جو ہر ظالم و جابر حکمراں کے دورِ حکومت میں سرکار کی ثنا خوانی کرتے آئے ہیں اور اس کے عوض اپنے لئے سامانِ خوشحالی حاصل کرتے رہے ہیں اور اپنے عزیز و اقارب کے لئے اونچے عہدے اور ٹیکنیکل کالجوں میں نشستیں حاصل کرتے رہے ہیں وہی اُس دور میں بھی اور آج کل بھی شوریدہ صاحب جیسے بلند خیال، روشن ضمیر، صاف گو اور استادانہ مہارت رکھنے والے شاعر کو پسِ پشت ڈالوانے میں کامیاب رہے۔ لیکن یارانِ فکر و فن کے مکر و فریب کے باوصف شوریدہ صاحب اپنے گہرے نقوش چھوڑ گئے۔

علی گڈھ کے ایک مشاعرے میں شوریدہ صاحب کو دعوتِ سخن دی گئی۔ علی گڈھ یونیورسٹی میں تہذیب و شائستگی کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس سے استثنیٰ صرف مشاعرے کو حاصل ہے۔ ان مواقع پر شاعروں کو بڑے ہی کٹھن اور نازک مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ خوش نوا شاعر بڑے کامیاب رہتے ہیں۔ یا طنز و مزاح سے کام لینے والے بچ جاتے ہیں۔ بہت ہی کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جو فکر و فن کی بصیرت بھی رکھتے ہوں۔ اور وہاں داد بھی پاتے ہیں۔ اس مشاعرے میں جوں ہی شوریدہ صاحب کا نام ڈائس سیکرٹری نے لیا اور اُن سے ڈائس پر آکر اپنا کلام سنانے کی التجا کی تو نوجوان سامعین کو غلط فہمی لگ گئی کیونکہ شوریدہ کے لفظ وہ سمجھ گئے تھے کہ کوئی خاتون شاعرہ ہے۔ لیکن

جوں ہی شوریدہ صاحب رونقِ محفل ہوئے تو محفل زعفراں زار ہو ئی۔ شوریدہ صاحب تاڑ گئے اور انہوں نے ذرا بھر تحمل کرنے کے بعد اپنا کلام شروع کیا اور پھر ہر طرف واہ! واہ! سبحان اللہ کیا خوب! کی آوازیں آنے لگیں۔ مکرّر اور مکرّر کی آوازیں بلند ہوئیں اور انؔ کو اس محفل میں اپنی ایک اور غزل بھی سنانی پڑی۔

ایمرجنسی کے زمانے میں شیخ محمد عبداللہ وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر نے ہر اس پرائیویٹ سکول کو بند کروا دیا جس پر درس گاہ اسلامیہ کا بورڈ لگا تھا۔ اُن دِنوں اسلام آباد اننت ناگ کے وسط ایک ہائی سکول درسگاہ اسلامی کے نام چل رہا تھا۔ اس سکول کو بند ہونے سے بچانے کے لئے تدبیریں ہوئیں جو کامیاب رہیں۔ اب سکول کی انتظامیہ کمیٹی بنانے کے لئے وہاں پڑھنے والے بچوں والدین کی میٹنگ بلائی گئی۔ چنانچہ مجھے بھی دعوت دی گئی۔ سکول کے قریب پہنچکر شوریدہ صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ اب باتوں باتوں میں سکول کو کوئی نیا نام دینے کی بات چلی۔ تو میں نے اُن سے کہا میرے ذہن میں ایک نام ہے لیکن چاہتا ہوں کہ آپ یہ نام تجویز فرمائیں۔ کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ اس میٹنگ کی صدارت کرنے کو مجھی سے کہا جائے۔ میں نے سکول کا نیا نام اِسلامی ماڈل سکول تجویز کیا۔ شوریدہ صاحب نے اس اصطلاح سے اولاً اختلاف کیا لیکن بعد میں اسے درست قرار دیا۔ حسن اتفاق سے میٹنگ کی صدارت میرے حصے میں آئی اور سکول کا مستقبل جہاں زیر بحث آیا وہاں اس نئے نام پر بحث ہوئی۔ شوریدہ صاحب نے اسلامی ماڈل سکول کا نام تجویز کیا۔ اس نام کے خلاف کئی حلقوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی اور شوریدہ صاحب کی تنقید اس سلسلہ میں کی گئی۔ چنانچہ انہوں نے بھری مجلس میں کہہ دیا کہ اُن کی اپنی تجویز نہیں ہے بلکہ صاحب صدر کی تجویز ہے۔ اس پر سنجیدگی سے بحث ہوئی اور پھر اُس سکول کا یہی نام پڑا ۔ ایمرجنسی کا دور ختم ہوا تو اس سکول کو درس گاہِ اسلامی کی سابقہ انتظامیہ نے ہمیں پوچھے بغیر ہی اپنی تحویل میں لیا۔ اور اس کے کئی سال

بعد فلاح عام ٹرسٹ وجود میں آیا تو اس ٹرسٹ نے اپنے سبھی سکولوں کے لئے یہی نام رکھ دیا۔

سکولوں اور کالجوں میں جہاں طالب علم اپنے استادوں کے اس لحاظ سے شاکی رہتے ہیں کہ وہ سکولوں اور کالجوں میں دل دہی اور تن سوزی کے ساتھ پڑھاتے نہیں ہیں وہاں شوریدہ صاحب سے پڑھنے والے اُن کے گرویدہ بن گئے تھے۔ کیونکہ اُن سے پڑھنے میں ایک لطف حاصل ہوتا تھا۔ کیونکہ رسمی طور پڑھانے کے بجائے طالب علموں کو اردو ادب سے ہی کیا حیات وکائنات کے رموز وکنایات سے واقف کراتے جاتے تھے اور کشمکشِ حیات میں علم و ادب کے رول سے روشناس کرتے تھے۔ اس طرح جن نوجوانوں کی تربیت وہ کرتے تھے اُن کے دل ودماغ میں یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ داستان سرائی اور شعر گوئی پردوں میں زندگی کے تلخ حقایق کو بیان کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ اور ادباء وشعراء نے یہی کام انجام دیا ہے۔ اس لحاظ سے شوریدہ صاحب طلبہ کو سماجی شعور سے آشنائی بخشتے تھے اور عصری تقاضوں سے بخوبی واقف کراتے تھے۔

ہمارے دور میں زندگی کا مزاج ہی کچھ کاروباری سا بن گیا ہے۔ جہاں خادم القوم اس خدمت کا بھرپور معاوضہ وصول کرتا ہے وہاں خادم دین بھی اس دوڑ میں خادم القوم سے کچھ پیچھے نہیں سوائے الاماشاءاللہ۔ ادیب وشاعر لوگ تو اس سلسلہ میں پہلے ہی بدنام لوگ ہیں۔ کیونکہ دانشوروں کا یہ طبقہ سرکار کے دسترخوانوں پر پلنے کا عادی بن چکا ہے۔ لیکن یہاں فردوسی، فیضی، ابوالفضل اور ذوق ہی نہیں ہیں بلکہ الطاف حسین حالی، محمد علی جوہر اور علامہ اقبال جیسے لوگ بھی رہے ہیں۔ شوریدہ صاحب اسی دوسرے زمرے میں شمار ہونے والے شاعر ہیں۔ انہوں نے نہ سرکار کی مدح سرائی کی اور نہ حکمرانوں کے ماتحت ذرایع ابلاغ کے پسندیدہ افکار کو اپنایا۔ اس لئے اُن کیلئے نہ روس کے ادبی حلقوں کا بلاوا آیا اور نہ دِلّی دربار کے انعام واکرام سے نوازا گیا۔ اور سب سے اہم بات اس سلسلہ میں ہے کہ شوریدہ صاحب نے ان اطراف کی طرف کبھی بھولے سے دیکھا بھی نہیں۔ وہ تمنا کرتے

تھے کہ اُن کو دربارِ خدا (بیت اللہ) اور دربارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری دینے کی سعادت حاصل ہو جائے۔ چنانچہ اُن کی دعائیں قبول ہوئیں اور وہ اس سعادت سے سرفراز ہوئے۔

گذشتہ تریپن ۵۳ سال کے دورِ ناہنجار میں ہم نے وادیٔ کشمیر کے اُن مسلمان ادیبوں اور شاعروں کو بھی دیکھا جو کائنات کو بے خدا بتاتے جاتے رہے ہیں۔ اور پھر رسالت کی اہمیت و افادیت کا تمسخر اڑاتے رہے ہیں اور تصورِ آخرت کو مضحکہ خیز قرار دیتے رہے ہیں۔ وادیٔ کشمیر کے جو علماء دین، واعظانِ کرام اور مفتیانِ عظام مجھ جیسے لوگوں کی نمازوں کا مذاق اڑاتے نہ تھکتے تھے لیکن وہ ان ادباء و شعراء سے کبھی نہ اجلتے تھے، گویا چھٹی تو اُن کو تھی اور محاسبہ میرا اور مجھ جیسے لوگوں کا تھا۔ اس دورِ فتنہ پرور میں شوریدہ صاحب کے ایمان و عقاید بڑے ہی صالح اور بہت ہی مستحکم رہے ہیں۔ یہ بات آجکل تو بڑی غیر اہم نظر آتی ہے۔ لیکن جو لوگ وادیٔ کشمیر کی گذشتہ آدھی صدی کے حالات پر نظر رکھتے ہیں اُن سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اُس دورِ پرفتن میں ایمان اللہ۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کو سینے سے لگائے رکھنے کے کیا معنی ہوتے تھے۔ جہاں ان عقاید سے اعراض کرنے والوں یا ان کا تمسخر اُڑانے والوں پر ہُن برستا تھا وہاں ان عقاید پر جم جانے والوں کی زندگی اجیرن بن جاتی تھی۔ شوریدہ صاحب نے دنیا کی چند روزہ زندگی کی تلخیاں اور محرومیاں خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور اس امید پر برداشت کیں کہ اگلی زندگی میں وہ ان تلخیوں اور محرومیوں کا معاوضہ پائینگے۔ میں دربارِ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ وہ اُن پر انعام و اکرام فرمائیں۔

شوریدہ صاحب اپنے فن اور اپنے قلم سے دولت کے انبار لگا سکتے ہیں۔ لیکن عصمت فن اور عظمتِ عقائد کا اُن کو پاس تھا۔ میں تو خیر نہ ادیب ہوں اور نہ شاعر ہوں، لیکن میرے علم میں یہ بات بخوبی ہے کہ بڑے بڑے ادیب و شاعر شوریدہ صاحب کی طرف اس طرح رجوع کرتے رہتے تھے۔ جیسے ایک طالب علم اپنے مربی اُستاد

کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ——————— فیضانِ علم کرنے والوں کے مقابلہ میں بھی شوریدہ صاحب اپنی منکسرالمزاجی اور نرم خوئی اور شیرینیِ زبانی کو ایک لمحہ کیلئے بھی رخصت نہ کرتے تھے ۔۔۔ سادگی اور خلوص سے بھرپور، اُن کا لہجہ تادمِ آخر قائم رہا۔ ہم نے اپنی زندگی میں علم و ادب کے نمرودوں کو بھی دیکھا۔ جو اپنی اس دنیا کے اندر اپنی خدائی کا ڈنکا بجاتے رہے ہیں۔ لیکن شوریدہ صاحب نے کسی نمرود کی خدائی کو کبھی مانا ہی نہیں اور عمر بھر کسی ابراہیمؑ کی تلاش میں رہے۔

شوریدہ صاحب کی سادگی سے متعلق ایک بات یاد آئی۔ سال نوے کے دوران نئی بستی اسلام آباد کشمیر کی سڑکوں پر کئی دفعہ کرفیو نافذ ہوئی اس لئے اس بستی کے لوگوں کو سختیاں برداشت کرنی پڑیں۔ لوگ وہاں سے ہجرت کر گئے۔ چنانچہ شوریدہ صاحب کی اہلیہ اور تین بچے شوپیان گئے۔ انہوں نے چاہا کہ وہ اپنا سامان وہیں لے جائیں۔ لیکن شوریدہ صاحب نے اُن سے کہا کہ وہ اتوار کے دن ضروری سامان لیکر خود ہی شوپیان آئینگے چنانچہ وہ اتوار کو شوپیان گئے تو اُن کے بچے اُس وقت حیران ہوئے جب انہوں نے دیکھا کہ شوریدہ صاحب کپڑے کے ایک چھوٹے سے بیگ "سامان" لے آئے ہیں۔ جب اس سامان کو جانچا پرکھا تو دیکھا کہ اس "سامان" کپڑے کے تین ٹکڑے تھے۔ جن میں انکا وہ کفن بھی شامل تھا جو وہ دس سال قبل حج سے لوٹتے ہوئے مکہ معظمہ سے آبِ زمزم میں بگو کر لائے تھے۔ یہی "سامان" بچانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس "سامان" کا یہی تیسرا حصہ اُن کے آخری کام بھی آیا۔

شوریدہ صاحب کا تذکرہ اُس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک نہ اس بات کو واشگاف الفاظ میں کہا جائے کہ شوریدہ صاحب بڑے پاک باز رہے ہیں اور متقیانہ زندگی گزارتے رہے ہیں۔ انہوں نے نہ حکمرانوں کے قصیدے لکھے اور نہ سیاسی لیڈروں سے روابط بڑھائے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے کئی شاعروں نے (قائداعظم محمد علیؒ)

جناح اور پاکستان کو صلواتیں سنا کر اپنی قسمت چمکائی لیکن شوریدہ صاحب کا دامن اس لحاظ سے دامنِ یوسف جیسا تھا۔ نجی زندگی اُن کی پاک تھی۔ وہ صوم و صلواۃ کے پابند تھے اور قرآن اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی شغف رکھتے تھے۔ تعلیم یافتہ حلقوں کے سامنے وہ درس قرآن دیتے رہے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی وہ منفرد تھے۔ شوریدہ صاحب اسی ذہن و فکر اور کردار و اعمال کے مالک جوانی کے عالم میں بھی تھے اور بڑھاپے میں بھی۔ انہوں نے یہ طرزِ عمل بڑھاپے کے دور میں وضعِ تکلف کے لئے اختیار نہیں کیا تھا اور نہ سماج میں اپنا وزن بڑھانے کے لئے یہ روش بڑھاپے میں اختیار کی تھی۔

.....

سید رسول پونچھی

شوریدۂ کشمیری

— ایک صاحبِ فکر شاعر

بٹ گیا اشعار میں شوریدہ غم
شاعری غمخوار ہو کر رہ گئی

اصلی نام غلام محمد ملک، تخلص شوریدہ، والد کا نام محمد عبداللہ ملک، ابن سلام ملک، ابن محمد ملک، میٹرک کی سند کے مطابق ۱۸ مارچ ۱۹۲۴ء کو شوپیان کے قریب ایک گاؤں پنجورہ میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں ایک مقامی مکتب میں داخلہ لیا۔ چھ مہینے میں قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ پھر گلستانِ سعدیؒ کے چند اوراق پڑھ کر گورنمنٹ پرائمری سکول پنجورہ میں درج ہوئے۔ پانچویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ۔ اے۔ وی، مڈل سکول شوپیان میں داخل ہوئے۔ یہاں اردو کے علاوہ عربی، انگریزی اور ریاضی میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسلامیہ ہائی سکول سرینگر میں داخلہ لیا۔ جوانی دنوں بڑی بات تھی۔ اپنے پسندیدہ مضامین میں دلچسپی لینے کے علاوہ اردو شعر و ادب کے مذاق سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ اُس زمانے میں یہاں پنجاب اور کشمیر کے

بہترین اساتذہ موجود تھے، ۱۹۴۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اپنا تعلیمی سفر جاری رکھنے کیلئے سری پرتاپ کالج سرینگر میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۳ء میں الیف۔ اے۔ پاس کرکے امرسنگھ کالج سرینگر میں داخل ہوئے، کیونکہ اُن دِنوں بی۔ اے۔ کی کلاسیں یہیں منتقل ہوئی تھیں۔ اب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کالج کے پرنسپل تھے۔ شوریدہ پہلے "فلاح" تخلص کرتے تھے۔ سری پرتاپ کالج میں ۱۹۴۱ء داخلہ لینے کے ساتھ ہی شوریدہ کی شعرگوئی کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اُن کی ایک غزل ایک ادبی جلسے میں سماعت فرمائی اور مسرت کے ساتھ اُن کے اچھے مستقبل کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر عبدالحکیم کی صدارت میں بمقام نمایش گاہ ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں انہیں بھی اپنا کلام پڑھکر سُنانے کا موقعہ ملا۔ اس سے پہلے مشاعرہ میں پڑھی دو غزلیں جناب عبدالسمیع پال اثر صہبائی کی نظر سے گزری تھیں اور انہیں بہت سراہا تھا۔ دونوں بزرگوں کی مُشفقانہ حوصلہ افزائی سے شوریدہ صاحب میں اعتماد پیدا ہوا بلکہ اول الذکر نے طلباء کے ایک ادبی مناظرے کے اختتام پر، جس میں وہ بھی (شوریدہ) شریک تھے، انہیں ..... شوریدہ کے بدلے "انسان" تخلص کرنے کا مشورہ دیا جو وہ بوجہ خاص اختیار نہ کرسکے۔ جہاں لفظ "شوریدہ" نہیں سماسکتا۔ وہاں مقطع میں اپنی کنیت "ملک" سے کام لیتے ہیں۔ کبھی کبھی بے تخلص ہی کلام چھوڑ گئے ہیں۔

دسمبر ۱۹۴۴ء میں کالج سے فارغ ہوئے۔ بی، اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ بیکار ہی رہنا پڑا۔ دو ایک چھوٹی ملازمتوں کو ذریعۂ روزگار بنانے کے ساتھ ہی بی، ٹی کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ ہائی سکول شوپیان میں مُدرس ہوگئے۔ یہاں پانچ سال کام کرنے کے دوران ۱۹۵۵-۵۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ایم۔ اے۔ اردو کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج اننت ناگ (کھنہ بل) میں اردو کے لکچرر ہوئے۔ منشی فاضل کے علاوہ، پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔ اے کی ڈگری بھی لی۔ ۳۱، مارچ ۱۹۷۹ء

کو پچپن برس کی عمر میں بحیثیت پروفیسر اردو ریٹائر ہوئے۔[1] اُن کی والدہ محترمہ اور رفیقۂ حیات کا انتقال فروری ۶۰ء میں ہوا۔

شوریدہ مرحوم نے اپنی سیمابی زندگی کے بارے میں مربوط طریقہ سے کچھ نہیں لکھا ہے۔ خود نوشت سوانح ترتیب دینے کا ارادہ تھا لیکن وہ یہ کام انجام دینے سے پہلے ہی ۱۹۹۱ء کو واصل بحق ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ وہ خود ہی کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

ریاضی، شاعری پھر عشق توبہ
مجھے شوریدہ اِن تینوں نے مارا

جبکہ غالبؔ کو صرف عشق نے لے ڈوبا تھا ؎

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

شوریدہ کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی جو ایک سیدھی سادی عام دیہاتی متوسط گھرانے کی عورت تھی، کا انتقال ۱۰، فروری ۱۹۶۰ء کو ہوا۔ اِس صدمۂ جانکاہ کے بارے وہ اپنے خطوط میں یوں اظہارِ غم کرتے ہیں۔:

"جناب ایک مدت کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ ہائے کیا عرض کروں۔ سالِ رواں میرے لئے مصائب کا ہجوم لے کر آیا۔ ایک طرف گھر میں بیماری اور تیمارداری۔ دوسری طرف تنہائی اور بے کسی۔ پھر کڑاکے کا جاڑا اور بے سروسامانی۔ آخر ۱۰، فروری کو رفیقۂ حیات اور اُس

---

[1] دیباچہ: جوشِ جنون: (۱۹۸۰ء): شوریدہ کشمیری: ص ۶: ۱۱-۱۷۔ شوریدہ صاحب زیارتِ حرمین شریفین سے ۱۹۸۲ء میں فیضیاب ہوئے۔

کے نوزائید کو صیادِ اجل نے بے دردی سے چھین لیا۔ ایک نامعلوم غم کا پرتو دِل پر پہلے ہی پڑا تھا۔ کسی کام میں دلچسپی نہ رہی تھی۔ بس ایک بے کیفی تھی اور ایک جانکاہی۔ اب طبیعت کچھ کچھ سنبھل گئی ہے لیکن زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ مرحومہ کی نشانی دو بچّے ہیں۔ جنہیں دیکھ دیکھ کر دل کو تسلّی دیتا ہوں۔ اور شعر و نوا سے کسی قدر تسکین پاتا ہوں۔ [1]

جناب میر غلام رسول نازکی کے نام اُن کی رفیقۂ حیات کے ارتحال پر ایک خط میں اُن کے غم میں شریک ہوتے ہوئے اپنے زخموں کو بھی تازہ کرتے ہیں۔:

"مجھے بھی اِس صدمے سے گزرنا پڑا ہے۔ اُس وقت میرے شباب کے آخری ایّام تھے۔ نو سال کی رفاقت کے بعد دو بچوں کو چھوڑ کر اہلیہ کا المناک طور پر انتقال ہوگیا۔ خدا مغفرت کرے۔ مجھ پر کیا گزری بیان سے باہر ہے۔ دوسرے نکاح کا مطلق خیال نہ تھا۔ اعزّہ و اقارب نے بچوں کو ماں کا بدل مہیا کرنے کے لئے مجھے اس پر آمادہ کیا۔ آخر معلوم ہوا کہ دنیا میں ماں کا بدل عنقا ہے اور آدمی کو آرام کے بجائے آلام نصیب ہوتے ہیں۔ مرضیٰ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ پھر بھی لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس مُسبّب الاسباب نے پر اسرار طور پر اور ہی بندوبست کر رکھا تھا۔"

---

[1] خطاب خامہ: (ستمبر ۱۹۸۶ء) خط بنام پروفیسر آل احمد سرور: ۲۵ مئی ۱۹۶۰ء ص: ۸۱

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما

فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما [۱] "

دوسری بیوی سے بھی جن سے نکاح کے بعد وہ پنجورہ شوپیان سے نئی بستی اسلام آباد (اننت ناگ) منتقل ہوئے، انکے دو بیٹے ہوئے ان کے علاوہ انکی بیوی بھی لواحقین میں شامل ہیں۔ اغلب ہے شوریدہ کی اِن کے علاوہ بھی کوئی اولاد ہو، خدا اُن کو بھی فائز المرام کرے، لیکن فیاض احمد اور سرمد عطا کی فکر اُن کو بجا طور پر یوں دامنگیر ہے۔

"آپ نے شروع میں فیاض احمد کے بارے میں پوچھا ہے۔ زبانی بھی استفسار کیا۔ میں نے حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ آپ کو اس کا اتنا خیال ہے؛ وہ اُس زمانے میں صرف تین سال کا بچہ تھا۔ تعجب ہے کہ آپ اُس کی توتلی زبان کا یہ فقرہ ..... "چہ کتہ اوشکھ بہ اوشس چہ چھاران۔ بہ ڈلہ گیوس تہ میوس۔" اب بھی دہرا سکتے ہیں۔ ماشاءاللہ آج وہ اکیس سال کا جوان ہے۔ لیکن اس سے جو امیدیں وابستہ تھیں پوری نہ ہوئیں۔ ذکاوت و ذہانت کے باوجود، وہ کوئی علمی کمال نہ کرسکا۔ اپنی بے چین طبیعت کی وجہ سے پی۔ یو۔ سی۔ پاس کرکے تعلیم چھوڑ دی۔ اور کسی قدر تجارت شہر کی طرف متوجہ ہوا۔ خیر وہ ایک پراُمنگ نوجوان ہے، کچھ نہ کچھ کرسکتا ہے۔ خدا کرے کہ وہ زندگی میں فائز المرام ہو۔ آپ بھی دُعا کیجئے۔ اُسے آپ کے پاس مع اپنی کتاب 'جوشِ جنوں' کے روانہ کرونگا۔ باقی بچوں کے لئے بھی دعائے نیک کیجئے۔

سب سے چھوٹا بچہ سرمد عطا چھ سال کی عمر کا سالِ گذشتہ سے نئی بستی کے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتا ہے۔ وہ کسی قدر فیاض احمد سے ملتا جلتا ہے، لیکن سب بچوں سے نرالا ہے۔ بڑا خوددار اور دلیر ہے۔ اُسکی صحیح اور بروقت تعلیم و تربیت کی مجھے

---

[۱] خطاب خامہ: (ستمبر ۱۹۸۶) : خط بنام غلام رسول نازکی۔

۵۔ نومبر ۸۰ء : ص: ۱۴۸ - ۱۴۹۔

بڑی فکر ہے۔ اِنشاء اللہ وہ کچھ کر کے دکھائیگا۔ کیا پتہ جب وہ کسی قابل ہوا۔ میں ہونگا بھی کہ نہیں۔"

پاک وصاف ماحول اور اچھی صحبت جیسی چیزیں اب عنقا ہوگئی ہیں۔ اکثر بچے بُری صحبت اور ٹیلی ویژن کی بیہودگیوں سے تباہ ہو رہے ہیں۔ آئے دن کے مشاہدات اِس پر دال ہیں۔ خدا خیر کرے۔"[1]

ایک سادہ دل صوفی صافی لااُبال قسم کے اِنسان اور شاعر کو بھی بیس سال کی طویل مقدمہ بازی کا ناخواستہ ایک فریق بننا پڑا۔ یہ شوریدہ کی سخت جانی ہی سمجھ لیجئے کہ مشقِ سخن بھی جاری رکھی۔ وہ خود بھی اِس امر کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اُدھر زندگی کا ایک بڑا سانحہ بلکہ حادثہ یہ بھی تھا کہ مجھے اپنے گاؤں (پنجورہ) میں اپنے ایک خریدہ قطعۂ ارضی سے متعلق کئی مقدموں میں اُلجھایا گیا تھا۔ جو بیس[۲۰] برس جاری رہے۔ مگر ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

میرے خلاف مع عزیزاں ایک تازہ فوجداری مقدمہ ہنوز جاری ہے ع"[2]

ان کے اپنے ایک الگ خط میں مقدمہ بازی سے فراغت کے مُبہم اور واضح اشارات ملاحظہ ہوں:

میں بھی موردِ مشکلات ہوں۔ محتاجِ قاضی الحاجات ہوں
آپ کو معلوم ہے کہ کوئی اولاد برسرِ روزگار نہیں۔ مجھ ایسا
کوئی وظیفہ خوار نہیں۔ چھ سال سے بیروزگار ہوں۔ بہرحال
شکرگزار ہوں۔ سالِ گذشتہ باغیچوں سے کچھ معتدبہ آمدن

---

[1] اخطاب خامہ: (ستمبر ۱۹۸۶ء) جناب غلام نبی گونی کے نام خط ۵۵: ۲۱ فروری ۱۹۸۶ء: ص ۱۹۲۔

[2] جوشِ جنوں: (۱۹۸۰ء) دیباچہ از: شوریدہ کشمیری (نومبر ۱۹۷۹ء): ص ۱۳۔

ہوئی جو اخراجات کے باعث گویا خشک پڑی زمین
پر ہلکی سی پھوار تھی۔ تاہم مجیب الدعوات سے برکت
کا طلبگار ہوں اور رحمت کا امیدوار"۔

اگست ۱۹۶۲ء میں علی گڈھ یونیورسٹی کی جانب سے "اردو صوفی شعراء تا ۱۸۵۷ء کا تنقیدی مطالعہ" کے موضوع پر آپ کے حق میں پی، ایچ، ڈی ڈگری حاصل کرنے کے لئے تحقیقی مقالہ کی منظوری دی گئی۔ تحقیقی کام کے لئے یونیورسٹی میں باضابطہ داخلہ لینا لازمی تھا۔ سرما کی چھٹیوں میں کئی سال تک علی گڈھ جاتے رہے۔ لیکن جس انہماک و یکسوئی اور فراغت کا تقاضا یہ کام کرتا تھا، وہ نامساعد بنی و دیگر معاملات کیوجہ سے میسّر نہیں ہوسکی، جسکی وجہ سے یہ اعلیٰ مقصد والا معنی خیز تحقیقی مطالعہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا ؎

حرفِ دل میں زباں پہ لا نہ سکا
کہ زباں چاک مہرِ قلم دیکھا!

یہ ہے ایک اجمالی خاکہ غلام محمد ملک شوریدہ کی بنی زندگی کا، جسکی ذات سے میرا رشتہ قریبی نہ تھا۔ لیکن خشخشی داڑھی والا پتلا لمبا سیاہی مائل گندمی چہرہ، ہمہ وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر خیالات و تصوّرات کی دنیا میں مستغرق، سیاہ گہری چمکتی متجسس سوالی آنکھیں، نیم ستواں ناک، قراقلی ٹوپی پہنے ہوئے، دراز قامت جھکاؤ دائیں جانب، ہاتھ میں بھاری بھرکم بیگ لئے، بیرونی رکھ رکھاؤ اور لازمی مردانہ بناؤ سے بے نیاز شاعر کی شخصیت آج بھی محبت و شفقت کے پیکر کی صورت میں میری نظروں کے سامنے کھڑی عنفوانِ شباب میں بھی کہہ رہی ہے ؎

ہے یہ شوریدہ غریبی کہ جنون
سر پہ سر پوش نہ پا میں پا پوش

شوریدہ کا شعور اس زمانے میں پروان چڑھا جب ملک میں ترقی پسند تحریک

کا غلغلہ تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک ایک فیصلہ کُن موڑ پر آگئی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے جو عالمگیر اثرات تھے اُن کی آنچ اس چمن زار میں محسوس ہونے لگی تھی۔ اُردو شاعری میں براہِ راست اظہار، خطابت تلقین کی لَے اتنی تیز تھی کہ کوئی اُسے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اقبالؒ کی پیمبرانہ آواز سبھی کو مسحور کر رہی تھی۔ شوریدہ کے اس مجموعہ (جوشِ جنوں) جس میں سنہ ۱۹۴۲ء تا سنہ ۱۹۶۰ء کا کلام ہے حُسن و عشق کی لَے کے ساتھ مناظرِ فطرت کی عکاسی بھی ہے، سماجی حقایق کی تصویر بھی۔ ایک سیاسی شعور بھی اور فطرت کی دلبری کے ساتھ اُسکی قاہری کا احساس بھی۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد برصغیر ہی میں نہیں کشمیر میں بھی بہت کچھ ہوا اور اُسکے نتیجے میں پرانے نظام کی جگہ ایک نئے نظام نے لے لی۔ عوام کی بہبود کی توجہ ضرور شروع ہوئی۔ مگر اُس کے نام پر کچھ زیادتیاں بھی ہوئیں۔ ایک حساس اور دردمند اِنسان اِن سب باتوں سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہتا۔ شوریدہ کے یہاں اِس داستان کے سارے کردار اوراقِ اشعار میں بکھرے ہوئے مل جائینگے۔[1]

شوریدہ کے ابھی تک دو شعری مجموعے، 'جوشِ جنون' (۱۹۸۰ء) اور 'جذبِ دروں' (۱۹۸۸ء) شایع ہو چکے ہیں۔ تفصیل یوں ہے۔

۱۔ جوشِ جنوں :-	۱۔ غزلیات :	۱۲۶	تخلیقی سفر
	۲۔ متفرق اشعار :	۳۵	۱۹۴۲ء
	۳۔ قطعات :	۳۰	تا
	۴۔ رُباعیات :	۸	۱۹۶۰ء
	۵۔ نظمیں :	۲۸	
۲۔ جذبِ دروں :	۱۔ غزلیات :	۶۷	۱۹۶۱ء
	۲۔ رباعیات :	۳۵	تا

---

[1] پیش لفظ۔ جوشِ جنون: پروفیسر آل احمد سرور : (۱۹۸۰ء) ص : ۹-۸

رسی قطعات : ۲۰ ۱۹۸۸ء

رسی نظمیں : ۵۰

اس کے علاوہ شوریدہ کے ادبی خطوط کا مجموعہ انہوں نے خود ۱۹۸۶ء میں زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے، اس مجموعہ میں کُل ، ۵ خطوط ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا پیش لفظ اور مصنف کا دیباچہ شامل کیا گیا ہے۔ خطوط کے آئینے میں شوریدہ کی ادبی شخصیت کے خدوخال متعین کرنے میں بلاشبہ مدد ملیگی۔ جہاں شاعری میں اُن کے نظریۂ شعروحیات کے بارے میں اشارات وکنایات ملتے ہیں وہاں خطوط میں ان کی وضاحت۔ اِسطرح شوریدہ کی شاعری، اُن کے خطوط اُن کی شخصیت اور اُن کے تخلیقی سفر کو اُجاگر کرنے کے ضمن میں لازم وملزوم ہیں۔ خاصکر ہمارے یہاں، جہاں اپنی ذات کی گُتھی بلا تردّد و تکلّف سُلجھانے کو گناہِ عظیم سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ یہی وہ بہترین طریقہ ہے جس سے کسی بھی تخلیقی شخصیت کی مختلف جہتیں، اپنے پُراسرار و دلرُبا چہروں سے نقاب الٹ کر ہمارے سامنے آسکتی ہیں۔ اُن ممتاز شخصیات میں جن کے نام شوریدہ کے خطوط "خطاب خامہ" میں شامل کیے گئے ہیں۔ رفیق خاور پروفیسر آل احمد سرور، جناب مرزا عارف، جناب مظفر عازم، جناب اعجاز صدیقی، جناب اختر محی الدین، جناب غلام السیدین، جناب علی جواد زیدی، جناب غلام رسول نازکی، پروفیسر حامدی کاشمیری، اور شمیم احمد شمیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شوریدہ صاحب ایک صاحبِ قلم نثر نگار بھی ہیں۔ یہ کتاب اُن کے نثری اسلوب میں اُن کی شخصیت لے آئی ہے۔ اُن کے اخلاق وکردار کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ جو ذات اپنی فکر اور اپنے کردار کے بنیادی خدوخال کے ساتھ شاعری میں کسی قدر چھپی ہوئی تھی۔ اُسکا اظہار نثر میں کھل کر ہوگیا ہے۔ نثر کا فن ہی ایسا ہے کہ بس نقاب اُٹھتا ہی جاتا ہے اور ذات وشخصیت کے نقوش تیزی سے اُجاگر ہوتے جاتے ہیں۔ یہ ایسے مکاتیب ہیں جو لمحوں کی گرمی نرمی میں بس لکھ دیئے گئے ہیں۔ خیالات اور جذبات کا بے باکانہ

اظہار کیا گیا ہے۔[1]

اس سے پہلے کہ شوریدہ کی شاعری کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود اُسکا نظریۂ تخلیقِ شعر پیش کیا جائے۔ تاکہ کام تھوڑا آسان ہو:-

"میں صرف اِس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میری شاعری جھوٹ موٹ کا رونا دھونا اور خیالی عشقبازی نہیں۔ اس میں قلبی واردات ہیں۔ گذشتہ دو تین سال سے اِس میں تغیر آرہا ہے۔ اس میں سیاسی دینی، اخلاقی اور دوسرے خیالات بھی نظم ہوتے رہتے ہیں لیکن میں اپنے شعر کو وہ تشکیل دینا نہیں چاہتا جس سے ظاہر ہو کہ یہ پروپگنڈا ہے۔"[2]

انہی بنیادی خیالات کو شوریدہ نے اپنی غزلوں و دیگر منظومات میں یوں باندھا ہے۔

حسن و خوبی کی ہے شیدا شاعری — خود بخود ہوتی ہے پیدا شاعری
انفس و آفاق میں دکھلائے ہے — قدرتِ حق کا تماشا شاعری
موجزن ہوتا ہے طوفانِ خیال — حشر سا کرتی ہے برپا شاعری
شاعری شوریدہ ہے دل کی دوا — ہم ذرا کرتے ہیں اس سے غم غلط
ماورائے عشق بھی ہے شاعری — زندگی کی زندگی ہے شاعری

(جذب درون)

دوسرے الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاعری تخلیق حسن بھی ہے، جو جینے کا ہر سلیقہ عطا کرتی ہے۔ یہ بے ہنگم زندگی اور انسان کے درمیان ایک پُراسرار توازن اور آہنگ کو جنم دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے، جسے محسوس کیا جاسکتا ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مختصر یہ کہ

---

[1] ایک لمحہ گفتگو کا۔ دیباچہ۔ خطابِ خامہ۔ (شوریدہ کشمیری) ڈاکٹر شکیل الرحمٰن۔ ص۔ ۷

[2] خطابِ خامہ (۱۹۸۶ء) شوریدہ۔ خط بنام مظفر عازم۔ ۱۱ فروری ۵۴ء: ص ۳۷

شاعری آفاقی قدروں کی حامل اور فن کی حیثیت سے سدا بہار ہونی چاہیئے تاکہ یہ ہر زمانے کے لئے ہو، بنی نوع انسان کے لئے بھی ہمہ گیر اور ابدی مسرت کی ضامن ہو۔

شوریدہ کو زمانۂ طالب علمی ہی سے شعر گوئی سے شغف تھا۔ وہ مزاجاً لڑکپن ہی سے عاشقانہ تھے۔ جیسا کہ وہ خود ہی کہتے ہیں ؎

عجب تھا ہائے کالج کا وہ دورِ طالب علمی
جب آتے جاتے میں ہوتا تھا، ہم پہلوئے جانانہ

ردیف "نوری" والی مسلسل غزل جسے شوریدہ اپنے معشوق کے نام تحریر کردہ نیاز نامہ کا شرف حاصل ہے۔ اسی دور کی یادگار ہے جو شعری خوبیوں اور فنی شگفتگی سے بھی پُر ہے۔ اسکی روانی بھی شوریدہ کے جنونِ سلیقہ شعار کی غمازی کرتی ہے ؎

تمام رات کیا یہ نیاز نامہ رقم — جوابِ ناز کا اب انتظاری ہے نوری
وہ شام ہی سے میری دیدنی تھی محویت — کسے خبر تھی سحر نور بار ہے نوری
تیرے نگر میں غریبُ الدیار ہوں لیکن — گلی گلی سے مجھے اِسکی پیار ہے نوری
دلِ طپاں کے لئے بس تیرا قد و گیسو — رواں دواں شجر سایہ دار ہے نوری
ہے دلفریب عجب کیا یہ گلشنِ گیتی — تیرے بغیر مگر بے بہار ہے نوری

وفادار اور سلیقہ شعار عاشق کو جب ایسے ہی اظہار محبت کے جواب میں ستم شعار حسینہ نے برسرِ بازار اُن کے وفا طلب چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کیا، تو بھی شوریدہ جفا پر بھی وفا ہی کا گماں کرتے رہے، کیونکہ عاشق پہ جفا بھی کرم ہی ہے۔ اس لئے کوئی شکایت نہیں۔ بہت کم لوگ اسطرح خود اپنی ذات پر ہنستے ہیں ؎

جز میرے خریدار نہ تھا دہر میں کوئی — کیا خوب ملا برسرِ بازار طمانچہ
اوسان خطا ہو گئے چہرہ بھی ہوا زرد — بجلی سی گری جب ملا یکبار طمانچہ

۱؎ جوشِ جنوں۔ شوریدہ۔ ۱۹۸۰ء ص: ۲۴۔۲۵ و ۳۷۔

سر گھوم گیا رنگ اڑا خون ہوا خشک — گویا کہ تھا تلوار کا اِک وار طمانچہ
چنگاریاں سی اُٹھ گئیں چہرے سے پیاپے — جاڑے میں ہوا خوب شرر بار طمانچہ
سردی میں رہا گرم بہت دیر تیرا منہ — نادار کے حق میں تھا کرفگار طمانچہ
مانا کہ گل اندام ہے وہ شوخ ستمگر — کچھ تھا نہ مگر اُسکا سبک بار طمانچہ
اظہارِ محبت کا گنہگار ہوا میں — تھا خط کا جواب ایک گرانبار طمانچہ
واصل جو ہوا اُس یدِ بیضا سے یہ رخسار — کیونکر نہ ہو دلدار کا دلدار طمانچہ
شوریدہ جفا پر بھی وفا ہی کا گماں ہو — ہوتا نہیں عاشق پہ کبھی بار طمانچہ

بیس سال کی عمر میں ایسے ہی تجربوں سے ایک غیر معمولی طور حسّاس انسان اور شاعر کو گزرنا پڑتا ہے، جو صرف وفاؤں کے نام پر مر مٹنا جانتے ہوں۔ کیونکہ انسانی عشق و محبت فطری و ارضی ہوتے ہوئے اللہ سے لو لگانے کا پہلا زینہ ہے۔

لو لگانا خدا کے بندوں سے — لو لگانا خدا سے ہوتا ہے

پھر یہ بھی کہ "لذّتِ تخلیق میں زندگی کا جوہر مضمر ہوتا ہے"۔

شوریدہ کو اردو سے والہانہ عشق ہے، حالانکہ انکی مادری زبان بھی ہماری ہی طرح کشمیری ہے۔ اردو ہی میں لکھنے کے ضمن میں اُن کا پیش کردہ جواز، قابلِ قبول تو نہیں ہو سکتا کیونکہ مادری زبان ہی ترسیلِ جذبات کا بہترین ذریعہ ہے۔ وہ اردو کے ممتاز شعراء سے متاثر ہونے کے بارے میں یوں اظہار کرتے ہیں۔

"نیاز مند دس سال سے وقتاً فوقتاً مشقِ سخن کرتا رہا ہے۔ اپنی اُفتادِ طبع اور فطری سوز و گداز کے سبب غزل گوئی پر مجبور رہے ابتدائے مشق میں جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور جناب اثر صہبائی نے فیاضانہ حوصلہ افزائی سے ممنون فرمایا" [1]

---

[1] خطاب خامہ: (۱۹۸۶) شوریدہ: خط بنام رفیق خاور۔ مدیر "ماہ نو" کراچی، ۱۷ نومبر ۵۳۔ ص:

"میرے محبوب شعراء کون ہیں اور میں اردو میں کیوں لکھتا ہوں؛ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانے ابتدائی زمانے ہی سے کئی اردو شعراء کا کلام میرے لئے دامن کشِ دل تھا۔ خواجہ میر درد، میر تقی میر، مرزا غالب، علامہ اقبالؒ وغیرہ سے خاص طور متاثر رہا ہوں۔ اردو سے مجھے بچپن ہی سے فطری مناسبت تھی۔"ع[1]

اردو کے اِن چوٹی کے صاحبِ طرز اور عہد ساز شعراء کے علاوہ بھی شوریدہ کی شاعری پر اثرات کہیں کنایتاً اور کہیں وضاحتاً نمایاں ہیں۔ سخن فہم اور سخن شناس حضرات یہاں پیش کئے گئے اشعار سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس سلیقہ سے شوریدہ نے فنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنا منفرد رنگ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے یہ اور بات ہے کہ اُنہیں ہر وقت کامیابی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ ایک نیا اندازِ بیان اختراع کر کے اُسے اپنی انفرادیت نبھانا خاصا مشکل ہے پھر بھی شوریدہ کی سعیٔ پیہم قابل صد تحسین ہے، بالخصوص جبکہ ہمارا ماحول ایسی کوششوں کیلئے صبر آزما حد تک حوصلہ شکن ہو۔

وہ رخسار دیکھے کوئی کس طرح　　اُسے نور میں وہ چھپانے لگے
نہیں پاتا میں اُسکو اور اپنے ہوش کو باہم
وہ آتا ہے یہ جاتا ہے، یہ آتا ہے وہ جاتا ہے

حُسن اِس درجہ شعلہ بار ہوا
لاکھ پردوں سے آشکار ہوا

تو ہے شوریدہ خضر راہِ عشق　　عمر تیری خدا دراز کرے
آنکھ مجبور ہے نظارے پر　　دہر کیا نگار خانہ ہے

ع[1] خطاب خامہ (۱۹۸۶) شوریدہ: خط بنام اختر محی الدین۔ نومبر ۱۹۵۴ء ص۔ ۴۸

آتشِ عشق نے جلا ہی دیا
خاک کو خاک میں ملا ہی دیا

یہ گلشنِ کشمیر وہ اُن کا قدرعنا
فردوس میں طوبیٰ کا شجر دیکھ رہا ہوں

مجھے حاصل ہے سرمستی ازل سے
رہینِ بادہ و ساغر نہیں ہوں

(جوشِ جنون)

دیکھنا ہے وہ پیکر عصمت
اپنی آنکھوں کو دھو رہا ہوں میں

عاشقو عشق میں کمال کرو
دل کو شایانِ ذوالجلال کرو

ہائے کس ڈھب سے چلی جاتی ہے
نور کی ندی بہی جاتی ہے

دیکھ کر میرا عشق بے پایان
حسنِ کُل ہو گیا سراسیمہ

یار سے ہونگا اگر ہم آغوش
تو ابد تک رہونگا میں بے ہوش

عشق میں چاہیئے شوریدہ کہ ہو پاس ادب
ہم سے دیوانوں پہ دنیا کی نظر ہوتی ہے

چھُپ چھپ کے یہ کون خود نما ہے
ہر شے میں ہیں یہ کس کے اشارات

جدھر بھی ڈالو نگاہ اُدھر سے تباہی برہمی ملیگی
تڑپتی دم توڑتی سسکتی کراہتی زندگی ملیگی

جلوہ گر وہ ہو گئے اُس آن سے
ہاتھ دھو بیٹھے ہزاروں جان سے

یہ نظر کہاں جمتی وہ نگہ کہاں اُٹھتی
رعب تھا یہاں چھایا شرم تھی وہاں طاری

نہ ہوں محبوب، گر تیری جفائیں
تو دل کیا اس خرابے میں لگائیں

بارِ احساں اٹھا نہیں سکتی
اتنی نازک ہے مفلسی میری

جادۂ حق ہو بارۂ الفت
کچلے جاتے ہیں ہم غریب بہت

کتنی عالی ہے بارگاہِ عشق
عرش بھی جسکا ایک زینہ ہے

گلستان کا شہر ہے ایک مدفن کی طرح
بے زباں لاکھوں زباں والے ہیں سوسن کی طرح

مکینوں سے خالی مکاں ہو گئے ہیں
زمانے کی نیرنگیاں دیکھتا ہوں

لگانے بھی بے گانے اب ہو رہے ہیں
سیاست کی شیطانیاں دیکھتا ہوں

ہزاروں کی شہادت ایک کروٹ ہے سیاست کی
ابھی خونِ بنی آدم کی ارزانی نہیں جاتی

خارزاروں سے بچ کے ہم نکلے
تیرے رُخ کے گلاب نے مارا
ہم بلاؤں سے جنگ کرتے ہیں
طبعِ فطرت کو تنگ کرتے ہیں

(جوشِ جنوں)

ایسے اشعار میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ شوریدہ کی شاعری کا آغاز نہایت ہی عہد ساز اور انقلاب آفرین دَور میں ہوا جب ہمارے کشمیری شعراء مہجورؔ، عبدالاحد آزادؔ، مرزا عارف و دیگر شعراء، طلوعِ صُبح کی خوش آمدید کہنے میں پیش پیش تھے اور خود علامہ اقبالؔ بیداری کی نئی لہر اور عظمتِ آدم کے اوّل نغمہ خواں کی حیثیت سے ہمیں خود کو پانے اور شکوہِ رفتہ کے پانے کی ہر رنگ ترغیب دیتے تھے۔ دنیا ایک نئے اور بیسویں صدی کے دوسرے بڑے انقلاب کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ یہ اُس کی اُفتادِ طبع ہی ہے یا کہ خلوت پسندی کہ انہوں نے دوسرے شعراء کی مانند خطیبانہ انداز میں بہ آوازِ بلند موہومِ آزادی کے نغمے نہیں گائے اور زیادہ اپنی شعری تخلیقات میں کنایتاً ہی روحِ عصر سمونے کی کوشش کی۔ جہاں انہوں نے اس کے برعکس شعوری یا غیر شعوری کوشش کی وہاں وہ ناکام ہی رہے ہیں۔

دِل و جگر پہ چوٹ لگے تو آدمی سراپا درد بن جاتا ہے ایک صاحبِ دِل حساس شاعر شوریدہ اپنی رفیقۂ حیات کے واصلِ حق ہونے پر بھی متانت و سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ؎

آہ خونیں جگر کہاں سے لاؤں
خشک ہوں چشمِ تر کہاں سے لاؤں
غم کے تیروں سے ہو گئے چھلنی
تازہ قلب و جگر کہاں سے لاؤں
تیرے کھونے سے کھو گئی ہے یہ
جنّتِ کاشمر کہاں سے لاؤں
آسمان و زمین ہیں بدلے سے
اب وہ شمس و قمر کہاں سے لاؤں

(فروری ۶۴ء)

نظم "والدۂ مرحومہ کی یاد" میں بھی نوحۂ غم کا انداز سادہ و سنجیدہ مجروح جذبات کا آئینہ دار ہے۔ یہ دونوں مراثی متلاطم جذبات کی عکاسی متوقع شدت سے تو نہیں کرتیں لیکن "مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ" پر شوریدہ کے یقین کی ترجمان ضرور ہیں ؎

نالۂ جانکاہ سے پتھر کو پگھلاتے ہیں ہم
سینۂ افلاک کو بھی آج برمانے ہیں ہم

کون اب کھڑکی پہ آئے دیکھنے کو بار بار
دیر سے گھر مدرسہ سے گاہ گاہ آتے ہیں ہم

سلسبیل و کوثر و نسیم ہوں تیرے نصیب
چشم دل سے درد و غم کے اشک ڈھلکاتے ہیں

(نومبر ۱۹۵۵ء)

۱۹۴۹ء میں "جموں جیل" میں تین ماہ کی قید و بند کی صعوبتوں کو اُس دلنشین پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ کال کوٹھڑی کی تصویر ہماری نظروں کے سامنے اُبھرتی ہے۔ اس نظم میں کوئی احساسِ ندامت نہیں۔ یہ ارباب حل و عقد پر طنز و ملامت ہے کہ ایک دیوانے کو پابہ زنجیر کر دیا ؎

آزادگی کا دل آتا ہے وہ زمانہ
وہ گلستانِ کشمیر، وہ اپنا آشیانہ

جنکے سبب یہ زنداں اپنا بنا ٹھکانہ
صیّاد ڈھونڈتا تھا پہلے سے وہ بہانہ

ایّام گرمیوں کے پھر تنگ و تار حجرے
سنگین و سخت تر ہے جموں کا جیلخانہ

کیڑے مکوڑے چھت سے ہیں فرش پر ٹپکتے
رہتا ہے سانپ بچھو کا خوف جاودانہ

کیا جانے اُٹھتی ہے کیوں اِک ہوک اپنے دل سے
گاتی ہے جب گجر دم کوئل کوئی ترانہ

اللہ مصیبتوں میں آتا ہے یاد سب کو
اِن سختیوں میں قیدی پڑھتے ہیں پنجگانہ

شوریدہ کو بھی ناحق پکڑا گیا ہے یارو
بیچارے کا ہے مسلک مدت سے عاشقانہ

"جذبِ دروں" کی غزلوں میں شوریدہ کے ارتقائی تخلیقی سفر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اِس مجموعہ میں غزل کی درخشندہ روایات کا تخلیقی ادراک فنی رچاؤ، تشبیہ و استعارہ کا فنکارانہ برتاؤ، تازہ کاری، روانی، سادگی و متانت جیسی دوسری شعری تخلیق کی خوبیوں کی ممکنہ

حد تک کارفرمائی ہے۔

ثوریدہ ایک ایسے شاعر ہیں جو اردو شاعری کی کلاسیکی روایات و آداب کا مطالعہ رکھتے ہیں، انہوں نے میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور حسرت موہانی کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اتنا ہی نہیں، بلکہ اردو غزل کے مروجہ مضامین یعنی ہجر و وصال، ساغر و صہبا، سماجی اونچ نیچ اور فطرت کی نیرنگیوں کو نظم کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے روایتی لفظیات ہی کا سہارا لیا ہے اکثر مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روایت اُن کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئی ہے اور اُن کے ذوقِ سخن کی حدیں مقرر ہیں۔ تاہم اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے عہدے کے تضادات یا بوالعجبیوں کی خبر نہیں رکھتے۔ اپنے فقیرانہ اسلوب زیست کے باوجود وہ گرد و پیش کی زندگی کے بدلتے حالات کا علم رکھتے ہیں۔ وہ سماجی سطح پر نیکی اور بدی کی آویزشوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے خیالات سے فوری جذباتیت کو فیہا نہیں کرتے اور ایک معصومانہ ردِّ عمل کے پابند رہتے ہیں۔ وہ انسانی شرافت، سچائی اور ہمدردی کی پامالی سے افسردہ ہو جاتے ہیں اور قلم برداشتہ اپنے فوری ردِّ عمل کو نظم کرتے ہیں۔[1] ریاستی سطح پر وہ اردو کی اُس شعری روایت کی آبیاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ جسے پروان چڑھانے اور نکھارنے میں طالبؔ کشمیری، شہ زور کشمیری، تنہا انصاری، غلام محمد میر طاؤس اور رسا جاودانی نے اپنے طور بھرپور حصّہ لیا۔ اب ذرا ثوریدہ کی "جذبِ دروں" میں بکھری گلکاری کے کچھ رنگ بھی دیکھتے جائیں ؎

رنگِ بلبل سرودِ بلبل میں — خونِ دل چاہیئے تغزل میں
وہ نظر پھر جگر کو برمائے — دل میں اُمید کی کرن سی ہے
آنکھ یوں خونبار ہو کر رہ گئی — وہ گل گلزار ہو کر رہ گئی
آندھیوں نے یوں بکھیرے بال سب — ہم نے دیکھے اُن کے خدّ و خال سب

---

[1] "جذبِ دروں" کا شاعر: ثوریدہ: حامدی کشمیری: ص: ۱۵-۱۹

بہار اب کے نہ جانے کھلائے گل کیا کیا
ہوا ہے میکدہ بروش دیکھیے کیا ہو

جیتے ہیں یوں کہ تن کے کپڑے کو
بسکہ اپنا کفن سمجھتے ہیں

دیدِ جاناں ہے نقدِ دل کے ساتھ
جنس بہ خوش خرید ہوتی ہے

عشق کے آس پاس ہے وہ شے
عقل سے جو بعید ہوتی ہے

بوالہوس بوالفضول ہوتا ہے
بے حیا بے اصول ہوتا ہے

کارواں کا ہی ہے خدا حافظ
رہ، خود، راہنما بھول گئے

دلبرِ بے بدل کا بسمل ہوں
اِک مجسم غزل کا بسمل ہوں

جانے کیوں موج آب ہے بیتاب
وصل میں بھی یہ سر پٹکتی ہے

جمہوریت کی مچ رہی ہے دھوم ہر طرف
فرصت نہیں مجھے کہ عدالت گزیدہ ہوں

کتنے شیطان ابھی جنم لیں گے
پھر سیاست کا پاؤں بھاری ہے

جب ملے تو موت بھی اچھی ملے
ہیں جہاں میں موت کے سامان بہت

مصحفِ روئے یار کی اللہ
ہر تلاوت جدید ہوتی ہے

کھلی آنکھ تو زندگی کی بساط
وطن میں غریب الوطن کی طرح

گلستان میں ہے شورِ زاغ و زغن
یہاں بلبل خوش نوا کیا کرے

لوگ ہیں اور قیدِ بے زنجیر
اپنا اپنا مکان زِنداں ہے

پھر تو اِک سایہ ساتھ ساتھ رہا
بس لڑکپن میں اک پری دیکھی

شان تیری ربوبیت آن مری عبودیت
دخل کہاں میں دے سکا تری سیاسیات میں

تو نگری ہو تو پہچان لے گی سب دنیا
ہو بے نوائی تو کوئی نہ آشنا نکلے

یہ آشیانے سبھی آندھیوں کی زد میں ہیں
پہاڑ کوئی اب یہاں چمن پناہ نہیں

کسی بھی شاعر کا کلام اوّل سے آخر تک ایک ہی سلسلۂ فکر و فن ہونے کے باوجود

مختلف النوع تجربات، نادرِ انکشافات اور صوتیات کا حامل ہوتا ہے۔ فکر و فن کے سلسلے کی ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ مربوط بھی ہوتی ہے اور اسکی الگ ایک انفرادیت بھی ہوتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعۂ کلام (جذبِ دروں[1]) اس حیثیت سے "جوشِ جنوں" کا تسلسل ہونے کے باوجود اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ شوریدہ صاحب کی غزل اور نظم دونوں میں روایت کا احترام بدرجۂ اتم نظر آتا ہے لیکن وہ روایت کے اسیر نہیں۔ اُن کی نظر دیر و زبہر ہی نہیں بلکہ امروز و فردا پر بھی ہے۔ عصرِ حاضر کی بلا تلاشیاں اُن کے یہاں غزل میں بھی ڈھل گئی ہیں اور نظم میں بھی۔

بنی نوعِ انسان کی حالتِ زار دیکھ، شوریدہ کی آنکھیں نم ہوتی ہیں۔ اُس کا جذبۂ مروّت، و ہمدردی متلاطم ہوتا ہے اور وہ کرامتِ انسانیت کا مداوا ربّ کائنات اور محسنِ انسانیت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے ڈھونڈتے ہیں ؎

الٰہی پھر مسلماں صاحبِ تقدیر ہو جائے	حیات اُسکی سراسر عشق کی تصویر ہو جائے
پھر سے دنیا کا بخت ہو بیدار	تاکہ جنت ہو یہ جہنم زار
شاہِ عرب ہمارا سردار اللہ اللہ	خلق خدا کا پیارا غمخوار اللہ اللہ
آبِ حیات کے یہ ظلمات میں ہیں چشمے	آیات اللہ اللہ اخبار اللہ اللہ
قرآن کی تفسیر ہے گفتارِ محمدؐ	اخلاق کی تعبیر ہے کردار محمدؐ
مکاں سے خدا کے مکاں جا رہا ہوں	میں مجذوب دارُالاماں جا رہا ہوں
خیالات و جذبات میں دل میں کیا کیا	لئے ساتھ اک کارواں جا رہا ہوں
نکل پڑے ہیں گھروں سے وہ اسطرح جیسے	نہ خانماں نہ کوئی خانوادہ رکھتے ہیں
جس پہ قرآں کا نور ہو نازل	نامیوں میں وہ ماہ کامل ہے

"نغمہ توحید" جوگی، اے خدائے ذوالجلال، حیرانِ خدا، طلبہ کا ترانہ، قرآن میں ڈوب جا،

---

[1] پیش لفظ: جذبِ دروں: پروفیسر جگن ناتھ آزاد: ص ۶۔ ۷

نبیؐ الاُمّی امام الانبیاؐ، ظہورِ آنحضورؐ، دعائے نور، چلتا بن ساجن کے ساتھ بھی اسی قبیل کی نظمیں جن میں شوریدہ رضائے الاہی کے ساتھ ساتھ فلاحِ دین و دنیا چلہتے ہیں۔ اور جہانِ رنگ و بو میں محبت کی فرمانروائی بھی۔ عمر

ایں دُعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

شوریدہ نے فارسی شعراء کی عارفانہ رباعیات کا ترجمہ بھی "جذب دروں" میں شامل کیا ہے، ترجمہ سو فیصدی تخلیقی اور کامیاب ہونا بہت مشکل ہے، لیکن ایک رباعی کا ترجمہ مجھے بہت کھٹکا کیونکہ ترجمہ میں اصل رباعی کی روح مجروح ہوئی ہے، جو یوں ہے۔

شیخ ابوسعید ابوالخیر	شوریدہ
عاشق کہ تواضع نہ نماید چہ کُند	عاشق کہ تواضع ہی دِکھائے ناچار
شب ہا کہ بکوئے تو نیاید چہ کُند	راتوں کو کوچے میں آئے ناچار
گر بوسہ زند زلف شرار نجہ مشو	ناراض نہ ہو جو زلف کالے بوسہ
دیوانہ کہ زنجیر نخاید چہ کُند	دیوانہ زنجیر بجائے ناچار

شوریدہ کے کلام میں طنز و ظرافت کے تیر و نشتر کہیں اِشارتاً اور کہیں اعلاناً بکھرے ملینگے لیکن "جذب دروں" میں انہوں نے دس بارہ صفحات "مطائبات" کے عنوان سے شامل کر دیا ہے جہاں اگر شوریدہ کا ہر تیر نشانے پر تو نہیں لگتا لیکن کبھی کبھی کامیاب ہو ہی جاتے ہیں ؎

اب ہے طرزِ امتحانِ عشق اور
فیل عاشق بوالہوس ہوتے ہیں پاس

دل خدا کا گھر ہے اور شیطان بھی
گھومتا پھرتا ہے دل کے آس پاس

گھر کے باہر ہے گاڑیوں کا شور
اور اندر ہے باہمی بکواس

ہو جو موسم گرما تو جدائی بہتر
ہو جو سرما تو حسینوں کا وصال اچھا ہے

میانِ عاشق و معشوق یکرنگی چلے کب تک
کبھی راضی، کبھی باہم خفا ہونا ہی پڑتا ہے

غلط رستے پہ جو پڑتے ہیں لٹ جاتے ہیں وہ راہی — کسی رہزن کو انکا رہنما ہونا ہی پڑتا ہے
حیا داری میں شوریدہ رضائے رب ہے پوشیدہ — مگر اک شب حیاءؔ بے حیا ہونا ہی پڑتا ہے

شوریدہ کی شاعری کا تیکھا اور انوکھا رنگ جو انہوں نے وطنِ مانوف کشمیر میں فطرت کی نیرنگیوں سے لیا ہے۔ انکی شاعری کا نہایت دلکش حباب قرار دیا جاسکتا ہے۔ منظر کشی میں تخیل و محاکات ذات و کائنات اور رومان و حقیقت کو ایک اکائی بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ کہیں غزل، کہیں مثنوی اور کہیں نظم کی صورت میں۔ نغمۂ بہار (دو غزلہ) 'و شونالہ' باغ نشاط' نیرنگِ زمستان' آندھی' ڈل کا منظر' ڈل اور چاند جیسی دوسری تخلیقات اِس ضمن قابلِ ذکر ہیں' جن کی روانی' سوز و ساز' موسیقیت' لفظیات سبھی رنگ بدلتے جمیل پیکر کی طرح اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں' میں چند ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کرتا ہوں ؎

باغ ہے جائے ملاقاتِ جمیل — ارتباط وار تباط وار تباط
گاؤ تکیہ اس کے پیچھے کوہسار — سامنے تالاب ڈل آئینہ دار

(نشاط)

دیکھو نیرنگ یہ زمستاں کا — رنگ بدلا ہے سب گلستاں کا
برف ہی برف ہے جدھر دیکھو — ساری فطرت ہے سیم بر دیکھو
اُجلے کپڑے درخت پہنے ہیں — اور بازو' میں اُن کے گہنے ہیں
لو یہ نور و ظہور کا عالم — ہر شجر پر ہے طور کا عالم
یخ قلم کیا چھتوں سے لٹکے ہیں — گھر دلہن ہے وہ اُسکے لٹکے ہیں
برف و یخ سے ڈھکے ہیں دشت و جبل — کاشمر بن گیا ہے شیش محل
اک جہانِ طلسم ہے وادی — یہ سمن بر ہمالیہ زادی
جب پڑے آفتاب کا پرتو — ٹوٹ جائیگا یہ طلسم نو
دہر ہے بے قرار شوریدہ — کہتے ہیں سب بہار کب آئے (نیرنگِ زمستان)

ڈل سہانا ہے کیا چاندنی رات میں — ہے یہ غرقاب کیا جلوۂ ذات میں
ایک طوفان برپا ہے جذبات میں — جانے ڈوبا ہے دل کن خیالات میں
غوطہ زن ہو کے موتی لگے ہاتھ کچھ
دامنِ دل میں لایا ہوں میں ساتھ کچھ

دلکشا یہ روپہلی فضائیں ہیں کیا — روح فزا یہ ٹھنڈی ہوائیں ہیں کیا
غم ربا یہ سریلی ہوائیں ہیں کیا — جاں ستاں موہنی یہ ادائیں ہیں کیا
کون وہ دل جس میں نہ یہ شوق ہو
ڈل میں بجرا اور اُس میں معشوق ہو

ہائے کیا دلکشا منظر شاں ہے یہ — چپچہوں کا عجب محشرستاں ہے یہ
حسنِ فطرت کا کیا مظہرستاں ہے یہ — یا پُراسرار کوئی پرستاں ہے یہ
یہ فسون و فسانہ کا گہوارہ ہے
یہ طلسم و ترانہ کا گہوارہ ہے

جگمگاتی ہے کیا ڈل میں وہ بارگاہ — یادگارِ جنابِ رسالت پناہ
گونجتی ہے صدا کیا یہ شام و صبا — لا الٰہ الا اللہ! لا الٰہ الا اللہ
کوثر و کشمر کے بھی ساقی ہیں وہ
آج بھی ہم غریبوں میں باقی ہیں وہ

(ڈل کا منظر)

یہ نظم جس کے چار ہی بند میں نے یہاں نقل کئے ہیں ایک تاریخی مشاعرے میں پڑھی گئی جو ۱۴ ستمبر ۱۹۵۹ء کو ناظمِ تعلیمات جموں و کشمیر کے اہتمام سے سرینگر کے سیاحوں کے استقبالیہ مرکز منعقد ہوا تھا' اتنی پیاری اور خوبصورت نظم کو انعام سے کیوں نہیں نوازا گیا یہ ایک الگ بات ہے اور بحث طلب امر بھی' لیکن شوریدہ صاحب کے مشاعرے کے بارے میں

مشاہدات قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہونگے، وہ لکھتے ہیں۔" ۱۴ ستمبر کی شام کو میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ مشاعرہ میں شریک ہونے کے لئے سیاحوں کے استقبالیہ مرکز کی طرف چل دیا جن کے لئے مجھے پے در پے تین دعوتی خط ملے تھے۔ آخر وزیر اعظم بخشی صاحب کی آمد کے بعد ہی اُنہی کی زیرِ صدارت مُشاعرہ ساڑھے چھ بجے شام شروع ہوا۔ پہلے تو مشقوں کو کلام سنانے کا موقعہ دیا گیا۔ چونکہ مشاعرے میں دو نشستیں ہونے والی تھیں ایک اردو دوسری کشمیری کی، نیز شعراء کی تعداد بھی خاصی تھی اِس لئے میں بے قرار سا رہا۔ سوچ رہا تھا" ایسا نہ ہو کہ مجھے اپنی نظم اطمینان کے ساتھ پڑھنے کا موقعہ ہی نہ ملے"۔ آخر جب میری باری آئی میں نے موقعہ کی نزاکت کے پیشِ نظر اور حسب عادت اپنی نظم تحت اللّفظ مگر جلد جلد پڑھنا شروع کی۔ دو ایک بند ہی سُنائے تھے کہ ہال کے عین درمیان شور وغوغا بلند ہوا۔ ایک گوشے سے داد دی جارہی تھی، شور کرنے والوں میں مشہور خوشرو جوان جس نے پہلے ہی میری طرف معاندانہ اِشارہ کیا تھا پیش پیش تھا۔ وہ تعمیر کا ایڈیٹر رہ چکا ہے اور کبھی میرا شاگرد بھی۔ اُس کی شوخی اور شرارت حد سے تجاوز کر گئی۔ نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ بخشی صاحب کی ڈانٹ بھی اُسے خاموش نہ کر سکی۔ لگ بھگ چار گھنٹے مشاعرہ کی دو نشستیں جاری رہنے کے بعد انعامات کا اعلان کیا گیا جس نے نہ صرف شعراء کو بلکہ اکثر سامعین کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیا۔ اردو میں ولی (امرچند) کو جو ایک بزرگ ہیں، دوسرا انعام اور آپ کو تیسرا دیا گیا، حالانکہ قبل الذکر کا کلام فن اور زبان وبیان کے اعتبار سے اغلاط سے پُر تھا۔ سیفی صاحب کو پہلا انعام عنایت ہوا۔ بیشک انکا کلام انعام کا مستحق تھا لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ کس درجے کے انعام کا، کیونکہ دیگر چند اصحاب کی نظمیں بھی اوّل درجے کی تھیں جن میں آپ کی بھی نظم ہے۔ کشمیری میں جو پہلا انعام راہی صاحب کو دیا گیا وہ اصولاً بالکل اُس کے مستحق نہ تھے کیونکہ اُن کی نظم "سونہ لانکہِ پیٹھ" (سونہ لانک پر) تین سال پرانی چیز تھی اور چھپ بھی گئی تھی نیز اُسکا موضوع "چاندنی رات میں جھیل ڈل کا منظر" کے بجائے کچھ اور تھا اور اُن کی تعریف میں ماسٹر زندہ کول صدر کشمیری نشست نے پہلے ہی فرمایا

تھا۔ راہی کا کلام سُننے کے بعد میرا کلام سُنانا زیب نہیں دیتا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اِس انعام کا مستحق فراق (غلام نبی) تھا۔ جس کو تیسرے درجہ کا انعام دیا گیا۔ دوسرا انعام فاضل صاحب کو ملا۔ وہ ضرور ایک کہنہ مشق شاعر ہیں لیکن کچھ عرصے سے بھٹی کرنے کی وجہ سے منظورِ نظر ہو گئے ہیں۔ الحاصل جس درجے کے انعامات جنکو مِلنے چاہیئے تھے انہیں، نہ دیئے گئے۔ اُردو کے انعامات کا تصفیہ جسٹس مرتضیٰ فضل علی، پنڈت نند لعل کول طالب اور مسٹر علی جواد زیدی کے ہاتھوں میں تھا اور کشمیری کے انعامات کا فیصلہ جسٹس شہیری، پروفیسر جیالال کول اور مرزا کمال الدین شیدا کے ذمہ تھا"[1]

شوریدہ جو شعر میں بڑا انہماک رکھتے ہیں، اُردو کے کلاسیکی شعری سرمایہ، فن کے اسرار و رموز، بیان اور حُسنِ بیان پر قدرت رکھتے ہیں اور وادی کے اچھے صاحبِ فکر شاعر ہیں، اپنے بے ریا نظریۂ فن کے برعکس، اپنا زورِ قلم کبھی کبھی بے جا طور ہنگامی موضوعات پر بھی صرف کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ بھی زندگی کی زُلفِ پریشاں ہی کی دین ہے۔ بقول اقبال ؎

اگر سخن ہمہ شوریدہ گفتہ ام چہ عجب
کہ ہر کہ گفت زگیسوئے او پریشاں گفت[2]

---

[1] خطاب خامہ: شوریدہ (۸۶ء) خط ۱۴ بنام تہنا انصاری (۱۳ اکتوبر ۱۹۵۹ء) : ص

[2] شوریدہ کی ایک اور تالیف "کلماتِ نبوی" (منظوم) کی طباعت کا ابھی انتظار ہے۔

پروفیسر الطاف حسین

شوریدہ کاشمیری ــــ

چند یادیں، چند باتیں

صاحبِ صدر اور معزز سامعین

مرحوم شوریدہ کاشمیری اور راقم کا آبائی وطن علاقہ شوپیان ہے۔ ڈگری کالج اننت ناگ میں شعبہ اردو میں ایک ساتھ زندگی کا طویل عرصہ بسر کیا ہے۔ علاوہ ازیں آج کل بہت عرصہ سے نئی بستی اسلام آباد میں ایک دوسرے کے ہمسایہ بھی تھے۔ اسلئے میرے عزیز شاگرد ڈاکٹر بشیر احمد نحوی صاحب نے "شوریدہ کاشمیری ۔ چند یادیں چند باتیں" کے موضوع پر اپنے خیالات اظہار کرنے کی فرمائش کی۔ لیجئے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے سلسلے میں چند یادیں پیش خدمت ہیں۔

مرحوم غلام محمد ملک شوریدہ کاشمیری ۱۸ مارچ ۱۹۲۴ء کو موضع پنجورہ تحصیل شوپیان کشمیر میں محمد عبداللہ ملک کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ہی گاؤں کے ایک مکتب میں شروع کی۔ قران مجید کے علاوہ گلستان سعدی پڑھنے کے بعد پنجورہ ہی کے گورنمنٹ پرائمری سکول میں داخلہ لیا۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ مڈل سکول شوپیان میں داخل ہوئے بعد میں میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی سکول سری نگر سے پاس کیا۔ اسی زمانہ سے اقبال، غالب

حالؔی، اسماعیل میرٹھی وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا اور اُن کے کلام سے متاثر ہوئے۔ مارچ ۱۹۴۱ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد سری پرتاپ کالج سرینگر میں داخلہ حاصل کیا۔ یہیں سے شعر گوئی کا آغاز ہُوا۔ پرنسپل ڈاکٹر محمد دین تاثیرؔ نے مشاعرے میں پہلی غزل سُن کر روشن مستقبل کی طرف اشارہ کیا۔ بی، اے کا امتحان امر سنگھ کالج سری نگر سے پاس کیا۔ یہاں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کالج کے پرنسپل تھے۔ اُن کی صدارت میں نمایش گاہ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ یہاں شوریدہ کاشمیری کی دو غزلوں کی ڈاکٹر صاحب نے خوب داد دی۔ اس سے قبل یہ دو غزلیں آثر صہبائی کی نظر سے بھی گذری تھیں۔ انہوں نے بھی اِن دو نظموں کو بہت سراہا۔ دونوں بزرگوں کی حوصلہ افزائی سے شوریدہ صاحب میں اعتماد پیدا ہوگیا۔ حکیم صاحب نے "شوریدہ" کے بدلے "انسان" تخلص رکھنے کی صلاح دی۔ مگر خاص وجوہات کی بنا پر وہ یہ تخلص اختیار نہ کرسکے بلکہ جیسا کہ خود دیباچۂ جوش و جنوُن میں لکھتے ہیں کہ "پہلا میرا تخلص "فلاحؔ" تھا [illegible] بدل دیا، کہیں کہیں ملک نام کا جُز بھی استعمال کرتا ہوں"۔

بی، اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد محکمہ فوڈ [illegible] سپلائیز میں ملازمت اختیار کی، لیکن یہاں کا ماحول شوریدہ صاحب کو پسند نہ آیا۔ مجبوراً [illegible] دیکر بی ایڈ کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں گورنمنٹ ہائی سکول شوپیان میں مدرس ہو گئے۔ [illegible] مرحوم شمیم احمد شمیمؔ، مرحوم عبدالقادر دیوان، محمد یوسف ٹینگ وغیرہ اِن کے شاگرد تھے۔ یہاں سے ہی بحیثیت پرائیویٹ امیدوار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ۱۹۵۵ء میں ایم، اے اردُو کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ڈگری کالج اننت ناگ میں بحیثیت لیکچرار مقرر ہوئے۔ آخر میں اِسی کالج سے ۳۱، مارچ ۱۹۷۹ء کو ریٹائر ہوگئے۔

شعروشاعری کا شوق کالج کے ہی زمانے سے ہُوا۔ علم عروض اور فن شاعری کے اسرار و رموز سے حتی المقدور واقفیت حاصل کی۔ شعر گوئی میں کسی کی تقلید نہ کی۔ کسی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ نہ کیا اور نہ کسی مکتبہ فکر سے مکمل طور وابستہ رہے البتہ میر تقی میرؔ، میر دردؔ، مرزا غالبؔ اور علامہ اقبالؔ سے کافی متاثر ہُوئے۔ حسرتؔ سے بھی کچھ اثر قبول کیا۔ اردُو نظم میں آج تک ان

کے کلام کے دو مجموعے "جوشِ جنون"، "جذب درون" اور نثر میں "خطاب خامہ" منظرِ عام پر آئے ہیں اسکے علاوہ "کلماتِ نبویؐ" کا اشعار میں اردو ترجمہ انشاءاللہ جلد ہی شایع ہوگا۔

افسوس یہ بلبل ہزار داستان ۸-اپریل ۱۹۹۱ء کی صبح کو دوست احباب سے دور ایچ، ایم، ایس، ہاسپٹل سری نگر میں خاموش ہوگئے۔ اور سرزمین نئی بستی اسلام آباد میں سپردِ خاک ہوئے۔

دوستو! شوریدہ مرے نہیں ہیں، مر بھی نہیں سکتے، مرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، زندہ ہیں، زندہ رہیں گے، ہاں بس اتنا ضرور ہوا ہے کہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے ہیں، بات یہ ہے کہ راہِ حق کے مسافر ہمیشہ زندہ جاوید رہتے ہیں۔ دس سال کی عرق ریزی کے بعد مرحوم شوریدہ صاحب نے "کلماتِ نبویؐ" کا منظوم ترجمہ کرکے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھا۔

ذاتی تعلقات کے سلسلے میں ایک نہایت دشوار و دلگداز مرحلہ امتحان ۱۹۶۴ میں آیا۔ یہ میری شوریدہ صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات تھی، میں پونچھ، اسلامیہ کالج سری نگر اور سوپور سے تبدیل ہوکر شوریدہ صاحب کے بدلے ڈگری کالج اننت ناگ آیا۔ آرڈر کاپی دیکھ کر شوریدہ صاحب سخت پریشان ہوگئے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہنے لگے... شاید میرا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے گا۔ تنکا تنکا جمع کرکے میں نے نئی بستی میں آشیانہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اب یہ کام ادھورا ہی رہے گا۔ مجھے شوریدہ صاحب کے زیرِ تعمیر مکان کے بارے میں کوئی علمیت نہ تھی۔ پانچ سال کے طویل عرصہ کے بعد اپنے ضلع میں آیا تھا۔ لیکن شوریدہ صاحب کے حالات کے پیشِ نظر خوشی کے بدلے افسوس ہی ہوا۔ فوراً مرحوم کو صلاح دی کہ آپ ایک عدد درخواست لکھئے، اس میں اپنی مجبوریوں کا ذکر کیجئے۔ میں بھی اسی درخواست پر لکھوں گا مجھے کچھ اور عرصہ کے لئے واپس سوپور جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ صبح جموں روانہ ہوئے۔ چار دن کے بعد واپس خوشی خرم لوٹے اور کہنے لگے "تاج ہوٹل جموں میں قیام کیا وہاں میری

تاج پُوشی ہوئی تبدیلی کا آرڈر ABEYANCE میں رہا اور میں صرف چار دن جوائن کرنے کے بعد واپس ڈگری کالج سوپور لوٹا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک اور ایڈشنل پوسٹ پر واپس آکر شوریدہ صاحب کے زیر سایہ کام کرتا رہا۔

ڈگری کالج اننت ناگ میں پرنسپل محمد مقبول فاضلی صاحب کا دور تھا۔ کالج طلباء کی تعداد میں ہوش رُبا اضافہ ہوا۔ دیہاتی طلباء کے اصرار پر کلاس اریجمینٹ کا سلسلہ رائج ہُوا۔ شوریدہ صاحب ایک قطعہ اراضی کے مقدمہ کے سلسلے میں اکثر رخصت پر رہتے تھے۔ مجھے اپنی کلاسز کے علاوہ اِنکے بھی پیریڈ لینے پڑتے تھے۔ کسی قدر تنگ آکر ایک روز باتوں باتوں میں، میں نے کہہ دیا "شوریدہ صاحب یہ مقدمہ بازی چھوڑ دیجئے۔ اِس روپیہ سے ایک اور قطعہ زمین خریدیئے۔ اِسے باغ میں تبدیل کیجئے۔ مستقبل میں یہ ایک معقول آمدنی کا ذریعہ رہے گا۔ فوراً جواب دیا" یہ ایک قطعہ زمین کا جھگڑا نہیں ہے۔ یہ حق و باطل، ظالم و مظلوم طاقتور اور کمزور کی جنگ ہے۔ زندگی کی آخری سانس تک میں یہ جنگ لڑتا رہوں گا۔" آخر بیس سال کی طویل مقدمہ بازی کے بعد ہائی کورٹ نے فیصلہ شوریدہ صاحب کے حق میں دیا۔ اُس روز کس قدر خُوش و خرم تھے اِس کی حد نہ پوچھیئے۔ حالانکہ مدعی کے اثر و رسُوخ اور سرمایہ کو ملحوظ خاطر رکھکر عدالت سے انصاف کی کوئی توقع نہ تھی اِسی لئے نظم عدالت میں اِس طرح رقم طراز ہیں۔

کوچہ یار میں عدالت ہے — دیکھئے کیسی اب سماعت ہے
اک طرف بس حق و صداقت ہے — اک طرف کذب ہے عداوت ہے
جو عدالت زدہ ہو برسوں سے — زندگی اسکی ایک مصیبت ہے
پیشیاں بے حساب و طولانی — خضر کی عمر کی ضرورت ہے
پھر بھی انصاف اگر نہ ہو آخر — حقِ مظلوم میں قیامت ہے

جیتنے پر بھی کوئی ہر جائے
اور ہارے اگر تو مر جائے

کشمیر میں سکوٹر پہلی بار آیئے۔ سرکار نے اعلان کیا کہ سرکاری ملازمین کے لئے بھی ایک مخصوص کوٹا رکھا گیا ہے۔ مطابق درخواست اپنی باری پر سکوٹر الاٹ ہوگا اور اِس کا قرضہ بھی ملے گا۔ آپ یہ جان کر حیران ہونگے کہ کالج بھر میں پہلا سکوٹر شوریدہ صاحب کو الاٹ ہوا۔ جبکہ باقی ساتھی ابھی مقرر کردہ فارم ہی کی تلاش میں تھے۔ شوریدہ صاحب کے سکوٹر لانے پر دوست اور ساتھی حیران تھے۔ معلوم نہیں سیکھنے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ کتنے حادثات کے شکار ہونگے۔ حیرانگی کی بات ہے کہ اپنی گھریلو مصروفیات اور شعر و شاعری میں محو ہونے کے باوجود صرف ایک دن کالج گراونڈ میں پریکٹس کی اور دوسرے روز سڑک پر ایک تجربہ کار سکوٹر سوار کی طرح چل رہے تھے۔ باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ اگر یہ کبھی میرے ساتھ بے وفائی کرے گا یعنی کسی حادثہ کی تیاری ہوگی تو میں اپنی لمبی ٹانگوں کا سہارا لیکر اِسے چھوڑ دونگا۔ کمال ہے کہ کبھی کسی حادثہ کے شکار نہ ہوئے۔ یہاں ایک بات یاد آئی۔ اُن دنوں ہمارا کالج ہوسٹل بٹینگو میں ہوا کرتا تھا۔ شوریدہ صاحب حسب معمول سکوٹر پر کالج آرہے تھے۔ بٹینگو کے قریب طلباء نے روک لیا اور عرض کی حضور آج آپ کہاں جارہے ہیں ہماری کلاس لینے کا ارادہ نہیں ہے۔ فوراً جواب دیا "کالج" تو لڑکوں نے کہا حضور کالج تو بہت پیچھے رہ گیا۔ واپس مڑے اور سٹاف روم میں بغیر کسی لگی لپٹی کے کہنے لگے "کم بخت اِس سکوٹر سواری میں بھی کیا مزہ آتا ہے۔ آج میں کالج کے بدلے بیجبیارہ کی طرف جارہا تھا۔"

ایک روز سٹاف روم میں بیٹھے تھے۔ طلباء کو امتحان کی تیاری کے سلسلے میں چھٹی دی گئی تھی نئے سٹاف ممبران کو شوریدہ صاحب کی مشہور نظم طمانچہ سُننے کا شوق ہوا۔ مشورہ کرکے ایک صاحب نے عرض کی شوریدہ صاحب سنا ہے کہ کالج کی طالب علمی کے دُور میں آپ نے عشق بھی کیا ہے۔ فوراً بول اُٹھے ہاں یہ عشق ایک ایسی آگ ہے ع لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے۔ ۱۹۴۴ء کا سال تھا۔ امر سنگھ کالج کا طالب علم تھا ایک حسینہ پر نظر پڑی۔ یہ ظالم دل مچل گیا۔ لاکھ سمجھانے پر باز نہ آیا۔ اظہار عشق پر مجبور کیا۔ لیکن وہ ظالم حسینہ قدرِ ناشناس نکلی۔ اظہار عشق پر زور زوردار طمانچہ مارا اور اس سارے واقع کو یوں بیان کیا۔

وہ امر سنگھ کالج سے جب گھر چلے اور امیر اکدل پار فرما گئے
ایک طوفانِ حسن و تجمل ہے سب نگاہوں پہ بازار میں چھا گئے بیخودی
میں کہیں سے کہیں چلایا، انکے پیچھے بہت دُور تک ہو لیا۔ مُڑ کے
دیکھا انہوں نے جو اک موڑ پر، میں بھی شرما گیا وہ بھی شرما گئے جیب
سے میں نے اِک خط نکالا ہی تھا تو جو اباً رسید اک طمانچہ کیا۔ ہائے
پھر ہوش کِسکے ٹھکانے رہے یوں وہ غیظ و غضب میں ستم ڈھا گئے

طمانچہ سے مجھ پر کیا گذری چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جُز میرے خریدار نہ تھا دہر میں کوئی — کیا خوب ملا بر سرِ بازار طمانچہ
اوسان خطا ہو گئے چہرہ بھی ہوا زرد — بجلی سی گری جب مِلا یکبار طمانچہ
سر گھوم گیا رنگ اُڑا خون ہوا خشک — گویا کہ تھا تلوار کا اک وار طمانچہ
اظہار محبت کا گہنگار ہوا میں — تھا خط کا جواب ایک گرانبار طمانچہ
شوریدہ جفا پر بھی وفا ہی کا گماں ہو — ہوتا نہیں عاشق پہ کبھی بار طمانچہ

ایک اور دن اِسی سٹاف روم میں ساتھیوں نے ارادہ کیا کہ مرحوم شوریدہ صاحب سے جیل جانے کی وجہ دریافت کریں اور اِس طرح سے اُس واقع کی جانکاری ہو جائے جو شیخ محمد عبداللہ صاحب اور شوریدہ صاحب کے درمیان پیش آیا۔ فوراً کہنے لگے۔ ۱۹۴۹ کا سال تھا۔ پرانے سکرٹریٹ کے صحن میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ شیخ محمد عبداللہ کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ وزیر اعظم تھے۔ لوگ شاید راشن یا پانی کے سلسلے میں نالان تھے۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے میرا بھی گذر اُدھر سے ہُوا۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں سیکرٹریٹ جا رہا تھا۔ لوگوں کی شکایت اِن کی طبیعت پر گراں گزری۔ اپنے غصہ کا نزلہ مجھ پر گرانا چاہا۔ اپنے قد کے مانند میرے قد کو دیکھ کر گماں گذرا کہ شاید میں اِن کا لیڈر ہوں۔ فوراً مجھ پر جھپٹ پڑے۔ میں بالکل نہ گھبرایا میرا کوئی قصور نہ تھا۔ اُسکے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اونچے قد کے دونوں آدمی آپسمیں گتھم گتھا ہو گئے۔ محافظوں نے مجھے فوراً اپنی گرفت میں لیا۔ گاڑی

میں بٹھا دیا۔ بڑے گھر کی سیر کرائی یہاں تک کہ بے گناہ ہونے کے باوجود دس مہینے جموں جیل کی بھی ہوا کھانی پڑی چنانچہ اِس یاد میں جموں جیل کے عُنوان سے نظم بھی سُنائی چند شعر ملاحظہ ہوں۔

آزادگی کا دل میں آتا ہے وہ زمانہ — وہ گلستانِ کشمیر، وہ اپنا آشیانہ
جسکے سبب یہ زنداں اپنا بنا ٹھکانہ — صیاد ڈھونڈتا تھا پہلے سے وہ بہانہ
ایامِ گرمیوں کے پھر تنگ و تار حجرے — سنگین و سخت تر ہے جموں کا جیلخانہ
چانٹا چٹوں، دھکی گالی گلوچ، غُرکی — افعال وحشیانہ، اخلاق سوقیانہ
خود پر گزرتی ہے جو کہتے ہیں بس وہی ہم — کیوں نفسِ واقعہ کو سمجھے کوئی فسانہ
شوریدہ کو بھی ناحق پکڑا گیا ہے یارو
بیچارے کا ہے مسلک مُدت سے عاشقانہ

کالج لیکچرار بھی دیگر گزیٹیڈ اسامیوں کی طرح اپنی تعلیمی قابلیت اور اسناد کے بعد پبلک سروس کمیشن کے ایک اور امتحان سے گزر کر مقررہ عہدہ پر تعین ہوتا ہے۔ چور دروازے سے داخلہ، سفارش اور سرمایہ سے آگے جانے کا سلسلہ ریاست کشمیر میں سب سے زیادہ عروج پر ہے۔ دیگر محکموں کے برعکس سینیارٹی کارکردگی اور تعلیمی قابلیت کو نظر انداز کر کے اپنے منظورِ نظر افراد کو آگے لے جانے کے لئے کالج لیکچراروں کو پروفیسر، ریڈر اور پرنسپل بننے کیلئے ڈیپارٹمنٹ اور پبلک سروس کمیشن کی ایک اور کمیٹی بنائی جاتی ہے۔ اس میں کم سروس والوں کو بھی انٹرویو میں شرکت کی اجازت دی جاتی ہے۔ ایک بار شوریدہ صاحب نے بھی اِس انٹرویو میں شرکت کی، ساتھیوں کے اصرار پر ایک عمدہ سوٹ بھی تیار کیا۔ خلاف معمول ٹائی بھی باندھی۔ حالانکہ ناٹ بنانے میں دشواری بھی آئی۔ رزلٹ نکلا۔ دیگر افراد کی طرح شوریدہ صاحب بھی اِس لسٹ میں نہیں تھے۔ رزلٹ میں سفارشی افراد کو چور دروازے سے داخلہ میں ہاتھ کی صفائی کا کمال حاصل ہوا تھا۔ سخت افسردہ ہوئے۔ عدالت میں بھی اِس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ دوسرے روز سٹاف روم میں پبلک سروس کمیشن کی کارکردگی پر ایک نظم سنائی چند

اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آج کالج میں آئی ہے تازہ خبر ہو گئے ہیں پروفیسر اب لکچرر
لو یہ سروس کمیشن کا اعجاز ہے بے ہنر باہنر باہنر بے ہنر
جو زبر تھے انہیں زیر کر کے رکھا زیر جو تھے انہیں کر دیا ہے زبر
اِن ڈسپلن کا شکوہ ہے سرکار کو ہے ڈسپلن سے سرکار خود بے خبر
ایک تقریب مہر ملاقات[1] تھی لاڈلے اُسکے جس میں ہوئے بہرہ ور
یوں جو حفظ مراتب مِلا خاک میں ہونگے کیا خاک پیدا یہاں نامور
ہاں عدالت میں حق پائینگے مستحق
جبکہ وہ ہو چکے ہونگے سب ریٹائر

شوریدہ صاحب ہنسی مذاق میں بھی کمال رکھتے تھے. ضرورت پڑنے پر بڑے حاضر جواب تھے۔ ایک روز ہم یونیورسٹی لائبریری کی عمارت میں بی' اے طلبہ کے پرچوں کی جانچ کر رہے تھے۔ اُن دنوں بنگلہ دیشی کپڑوں کا عام رواج ہوا تھا۔ شوریدہ صاحب نے بھی کہیں سے ایک اور کوٹ کا انتخاب کر کے پہنا تھا۔ پروفیسر ستار احمد شاہد کی نظر اِس پر پڑی کہنے لگے شوریدہ صاحب آج آپ ایئزن ہاور لگتے ہیں اور اِس کوٹ کی بہت تعریفیں مذاق میں کرنے لگے۔ شوریدہ صاحب نے جواب میں صرف اسقدر کہا" ہاں آپ ان کپڑوں کی تجارت کے پرانے ماہر ہیں (اشارہ ان کے آبائی پیشے کی طرف تھا) اِس پر قہقہہ بلند ہوا۔ شوریدہ صاحب صاف بچ نکلے اور وہ بھی بہت محفوظ ہوئے اِس واقعہ کا ذکر شوریدہ صاحب نے اپنے ایک دوست پروفیسر سید محمد رضا سے بھی ایک خط میں کیا ہے۔

کالج کے طلباء تعلیمی دورے پر گئے تھے۔ شوریدہ صاحب نے بھی ساتھ آنے کی خواہش ظاہر کی۔ واپسی پر کلکتہ سے دہلی ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ کافی تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے۔

---

[1] جو محض ایک بہانہ تھا اور جسکے ہاتھوں کئی لکچرار اپنے اساتذہ سے بھی سینئر ہو گئے۔ (یعنی انٹرویو)

شوریدہ صاحب نے چائے پینے کی خواہش ظاہر کی۔ ریلوے سٹیشن پر ہی چائے کا انتظام ہوا۔ سب چائے پینے لگے۔ شوریدہ صاحب کے سامنے چائے کی پیالی ہے۔ پیالی کو غور سے دیکھ رہے ہیں ہاتھ میں نہیں اٹھاتے ہیں۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگے معلوم نہیں کتنے شرابی لوگ اِس پیالی سے چائے پی چکے ہونگے معلوم نہیں اِس بے چاری پیالی کا غسل بھی کبھی ہوا ہے۔ خیر اب ایک ترکیب نکلی جہاں سے پیالی کو ہاتھ میں پکڑتے ہیں اسی کونے پینے لگے اور فرمایا کم سے کم کسی نے اِس کونے کے ساتھ ہونٹ نہ ملائے ہونگے۔

خوش قسمتی سے میں نے بھی اپنا غریب خانہ شوریدہ صاحب کے مکان کے قریب ہی تعمیر کر دیا ہے۔ کالج کی ملاقات کے علاوہ میرے غریب خانہ کو بھی اکثر روشن کرتے تھے۔ اِن کے بچے بھی اکثر کسی ضروری کام کے سلسلے میں آتے تھے۔ ایک روز میں اپنے باغیچہ میں بیٹھا تھا۔ اِن کا لڑکا شاید انعام میرے ہاں آیا۔ اِن کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ پوچھا اِسے کیا کرنا ہے تو ہنسا اور کہنے لگا مجھے پوسٹ آفس جانا تھا۔ میں آپ کے گھر آیا۔ مرحوم دوسرے روز گھر تشریف لے آئے یہ واقعہ سنایا اور مبارک باد دی کہ شاید یہ آپ کی طرح شاعر بنے گا۔ کچھ لمحہ خاموش رہے۔ ٹھنڈی سانس بھر لی پھر کہنے لگے یہ غلط نہیں ہے کہ چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے۔ افسوس میرا کوئی بچہ بی اے پاس بھی نہ کر سکا۔ شاعر کیا بنے گا۔ اب میری نظریں صرف چھوٹے بچے سرمد کی طرف لگی ہیں۔ شاید وہ میرے نقش قدم پر چلے گا۔ ایک واقعہ سناؤں چند روز قبل میں بچوں کو بوٹ لیکر گھر آیا تھا۔ جب سرمد کو اپنے بوٹ پر نظر پڑی تو کہنے لگا۔ "ابا ابا! دیکھو یہ بوٹ" مکہ بس جیسا ہے یعنی آگے سے چپٹا ہے۔ مجھے اسکی یہ مثال بہت پسند آئی چنانچہ پروفیسر سید محمد ضیا کو ایک اور خط میں اپنے بچوں کے بارے میں لکھتے ہیں "میں بھی مورد مشکلات ہوں۔ محتاج قاضی الحاجات ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کوئی اولاد برسر روزگار نہیں، مجھ ایسا کوئی وظیفہ خوار نہیں، چھ سال سے بے روزگار ہوں۔ بہر حال شکر گزار ہوں" سال گذشتہ باغیچوں سے پہلی بار کچھ معتدبہ آمدن ہوئی جو اخراجات کے باعث گویا خشک

پڑی زمین پر ہلکی سی پھوار تھی، تاہم مجیب الدعوات سے برکت کا طلب گار ہوں اور رحمت کا امیدوار" اسی طرح غلام نبی گونی صاحب کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں "بڑا لڑکا اکیس سال کا جوان ہے لیکن اس سے جو امیدیں وابستہ تھیں پوری نہ ہوئیں ذکاوت و ذہانت کے باوجود کوئی علمی کمال نہ کر سکا۔ اپنی بے چین طبیعت کی وجہ سے بی، یو سی پاس کر کے تعلیم چھوڑ دی.... سب سے چھوٹا بچہ سرمد عطا چھ سال کی عمر کا، سال گذشتہ سے نئی بستی کے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتا ہے، وہ کسی قدر فیاض احمد سے ملتا جلتا، لیکن سب بچوں سے نرالا ہے، بڑا خوددار اور دلیر ہے اسکی صحیح اور بروقت تعلیم و تربیت کی مجھے بڑی فکر ہے۔ انشاءاللہ وہ کچھ کر کے دکھائیگا۔ کیا پتہ جب وہ کسی قابل ہوا میں ہونگا بھی کہ نہیں"۔

ایک اور روز غریب خانہ پر تشریف فرما تھے، میٹھی چائے کا دور چل رہا تھا۔ باتوں باتوں میں شاگردوں کا ذکر چھڑ گیا تو میں نے پوچھا۔ آپ کو اپنے کس کس شاگرد پر ناز ہے فرمانے لگے تعداد طویل ہے پھر بھی شمیم، عبدالقادر دیوان، ٹینگ، حمیداللہ اور نخوی سرفہرست ہیں، مرحوم شمیم احمد شمیم کے زور قلم اور قوت بیان سے میں سخت متاثر ہوا ہوں، کاش وہ سیاست کے دلدل میں نہ پھنس گیا ہوتا، مرحوم عبدالقادر دیوان کی ادب نوازی اور محمد یوسف ٹینگ کی محنت اور وسعت مطالعہ نے مجھے متاثر کیا ہے۔ حمید صاحب کی دینی علوم کی واقفیت اور ڈاکٹر بشیر احمد نخوی کی قوت یاداشت اور طرز بیان کی داد دیئے بغیر میں نہیں رہ سکتا ہوں لیکن ریڈیو اور ٹی وی جیسی گندھی جگہ میں پھنس گیا ہے، یہاں ضمیر کشی کرنی پڑے گی یاد ہے اُن دنوں نخوی صاحب دوردرشن میں ملازمت کرتے تھے۔

مرحوم شوریدہ صاحب کے عادات و خصائل کا باب بھی بہت وسیع تھا اور علمی و عملی جوہروں کی طرح وہ خصائل میں بھی بالکل یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ مثلاً سحر خیزی ابتدائی دور ہی سے اُن کی فطرت ثانیہ بنی رہی۔ وہ ہمیشہ اول وقت اٹھتے۔ شاگردوں کو بھی سحر خیزی کا درس دیتے گویا کہ اس شعر کی عملی تصویر تھے ؎

عبادت سحری را کمن نظیری کم کہ ہر چہ کرد دعا ہائے صبح گاہی کرد

۱۹۸۵ء کا سال تھا۔ تبلیغی جماعت کا مرکز اسلام آباد میں ہماری مسجد شریف نی بستی بنی تھی۔ بھوپال میں جو ہر سال ۲۳، دسمبر سے ۲۵، دسمبر تک تاج المساجد میں اللہ والوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ ہمارے قصبہ اسلام آباد سے بھی تقریباً ۳۰۔ افراد پر مشتمل ایک قافلہ اس اجتماع میں شرکت کے لئے ہماری مسجد شریف سے روانہ ہوا۔ راقم کے ذمہ ٹرانسپورٹ وغیرہ کا کام سونپا گیا۔ اِس قافلے میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو قاضی گنڈ سے آگے کبھی نہیں گئے تھے۔ راستے میں شوریدہ صاحب ان کا بھرپور خیال رکھتے تھے۔ ایک ماہر گائیڈ کی طرح جگہ جگہ انہیں نئے نئے مقامات سے واقفیت دلاتے تھے۔ راستے میں جو کوئی نئی چیز یا میوہ ملتا انہیں کھلاتے تھے۔ بھوپال پہنچ کر اُس شیش محل کو دیکھنے کے لئے سخت بیتاب تھے جہاں علامہ اقبال نے دورہ بھوپال کے وقت قیام کیا تھا۔ اُس مقبرہ پر بھی فاتحہ پڑھی جہاں گیس ٹریجڈی کے دوران بے شمار افراد دفن کئے گئے ہیں۔ بھوپال کی مختلف مساجد کو دیکھنے کے بعد بہت خوش بھی ہوئے اور غمگین بھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو مختلف درجوں میں حفظ قران میں محو دیکھ کر کہنے لگے" دیکھے کس طرح یہ لوگ کفرستان کے صحرا کے تیز اور تند ہواؤں میں اسلام کی شمع جلائے رکھے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اسلام کی کھلی فضاء میں اپنے بچوں کی دینی تعلیم سے بے پروا ہیں۔ انشاء اللہ واپس پہنچ کر ہم بھی اپنے محلے میں اِس شمع کو جلانے کی کوشش کرینگے"۔ چنانچہ اہالیان نئی بستی اسلام آباد مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مسجد شریف کے ساتھ ہی الگ ایک درس گاہ بھی تعمیر کی ہے اور خود مرحوم شوریدہ صاحب اِس درسگاہ میں محلے کے بچوں کو قران شریف کی تعلیم اور ترجمے وغیرہ کا درس دیتے تھے۔ محلے میں دینی تعلیم سے واقف لوگوں کی کمی نہیں۔ لیکن محلے کے بچوں نے درس و تدریس کیلئے شوریدہ صاحب ہی کا انتخاب کیا۔ اِسکے علاوہ دینی علوم سے جانکاری حاصل کرنے کے لیے اکثر مسجد شریف کے حمام اور صحن میں طلباء اور دیگر افراد کا بڑا حلقہ شوریدہ صاحب کے

گرد موجود ہوتا تھا۔

موجودہ حالات کے پیش نظرانِ کے دل میں یہ خیال بھی موجزن ہوا کہ مسجد شریف میں ایک بیت المال کا قیام بھی عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ ۱۹۹۰ء کی ابتدا میں رسید بک کا مسودہ قرانی آیات کا حوالہ دیکر خود تیار کر کے راقم اِسے شایئع کرنے کا کام سونپا۔ تاکید کی کہ رسید بک کی کتابت شایع کرنے سے پہلے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرے عزیز شاگرد ثناءاللہ میر نے کتابت کی مشاہدہ کرنے کے بعد شایع کرنے کی اجازت دی۔ آپ یہ جان کر حیران ہونگے، رسید بک کی پہلی ٹکٹ شوریدہ صاحب نے باوجود اپنی قلیل آمدنی کے پچاس روپیہ دے کر کاٹ لی۔ ؛

~~~●~~~
~~~

محمد شفیع خان

شوریدہ کاشمیری

— شخص اور شاعر

پروفیسر مجیب ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

"چھوٹی شخصیتیں سمندر کی کشتیوں کی طرح چاہتی ہیں کہ احتیاط کا لنگر ہو، ہر دل عزیزی کا بادباں ہو، قومی جذبات کی ہوا موافق ہو۔ اور چلتی رہے۔ سستانے اور پناہ لینے کے لئے ذاتی زندگی اور معاملات کا ساحل قریب رہے۔ تب کہیں وہ اپنی چال دکھا سکتی ہیں اور منزل تک پہنچانے کا حوصلہ کر سکتی ہیں۔ وہ موج تو چیز ہی اور ہے جو سمندر کی تھاہ لیتی ہے کہ گہرائی کافی ہے یا نہیں، ہوا کو للکارتی ہے کہ دم ہو تو ذرا اپنا زور دکھا۔ آسمان سے کہتی ہے کہ ذرا اور اونچا ہو سکتا ہو تو ہو جا۔ اِسے ساحل سے عداوت ہوتی ہے وہ آپ اپنی منزل ہوتی ہے۔ اسے کہیں جانا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے اٹھنا اور تڑپنا بس ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت ایسی ہی ایک موج تھی اور اِس کا سمندر عالم اسلام تھا۔ میں اس سمندر کا ایک گمنام قطرہ بھلا کیا بتا سکتا ہوں۔ کہ موج اٹھی اور اس نے سمندر کو تہہ تک ہلا دیا۔ تڑپ کر آسمان کا منہ چوما اور پھر بیٹھ کر سمندر بن گئی تو اس میں موج اور موج کو

پیدا کرنے والے کی کیا مصلحت تھی۔ وہ کچھ اور کیوں نہ تھی۔ اس نے کچھ اور کیوں نہ کیا۔ میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ یہ موج نہ ہوتی تو کوئی نہ تھا جو مجھے اپنے پہلو میں لیتا اور اتنا اونچا اُٹھا دیتا کہ سمندر کو دیکھوں، سمندر کے پھیلاؤ کو دیکھوں، دونوں جہاں پر ایک نظر ڈالوں اور تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لوں کہ قطرے کی بھی کچھ ہستی ہوتی ہے'۔

پروفیسر مجیب نے ان لافانی الفاظ میں ایک عالمی حوصلہ، عالی ظرف، اور ایک عالی دماغ شخصیت کے خدوخال ابھارے ہیں۔ علامہ اقبال ایک آفاقی شاعر ہیں۔ ان کی مدح میں اس سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ زبان قلم چلانے والے دانشور پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ایک عظیم بلند بالا شخصیت اور ایک پست ہمت و حوصلہ شخصیت میں جو فرق ہو سکتا ہے، اس پر یہ الفاظ بہت خوبی کے ساتھ محیط ہیں۔ ایک بڑی شخصیت کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اُس سے نہ احتیاط کے لنگر کی تلاش ہوتی ہے اور نہ ہی ہر دل عزیزی کے بادبان کی۔ وہ زندگی کے قابو میں نہیں آتی بلکہ زندگی کو ہی وہ اپنے قابو میں لاتی ہے۔ بلاشک چھوٹی اور بڑی شخصیت میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ گرفتار دنیا ہوتی ہے اور یہ دنیا سے بے نیاز۔ غور کیجئے، تو یہ کتنا بڑا فرق ہے جو انبوہ عامیاں کے وسیع و عریض سمندر میں سے بہ غواصیٔ ہزار گوہر یکدانہ کو چن کے لاتی ہے اور پھر اِس کو بہت بقائے دوام میں جلوہ افروز کرتی ہے تاکہ تہذیب تک اِس سے جلا پاتی رہے کہ جب تک اس خاکدان پر مشیت ایزدی کے تحت سلسلہ حیات قائم ہے۔ ایک بڑی شخصیت کے لئے راستہ پُرخار ہوتا ہے۔ صرف اس لئے کہ یہ راستہ باقی راستوں سے الگ ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اِس پُرخار راستے پر ایک عظیم شخص مدتوں تک چلتا رہا۔ لیکن لوگوں کی نظروں سے اوجھل۔ وہ لہولہان ہوتا رہا لیکن کاروبار حیات میں مصروف لوگوں میں سے کس کو احساس اور پھر فرصت کہ چل کر دیوانے کا حال پوچھے۔ لیکن وہ شخص ہے کہ بس چلا ہی جا رہا ہے۔ ایک شان قلندری

کے ساتھ۔ ایک صدائے پُرسوز کے ساتھ۔ جوشِ جنوں کے ساتھ اور ایک منفرد جذب دروں کے ساتھ۔ اس کے شوق کی کوئی انتہا نہیں۔ ایک پورا ہو تو وہ پکار اٹھتا ہے ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
میں نے دشتِ امکان کو ایک نقشِ پا پایا

زمانہ ساتھ دے، نہ دے۔ وقت کے اربابِ حل و عقد سے صلہ ملے، نہ ملے۔ یارانِ نکتہ دان سے داد ملے، نہ ملے۔ ایک بڑی شخصیت اپنی چال ٹھیک اپنے ڈھنگ سے والہانہ چل ہی جاتی ہے۔ شوریدہ کاشمیری بھی ایک بڑی شخصیت کی آن بان کے ساتھ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ حق مغفرت کرے کیا خوب آدمی تھا۔ زندگی نے اُس کو کچھ نہ دیا لیکن اُس نے زندگی کو بہت کچھ دیا۔ اس کے ساتھ یہاں انصاف نہ ہوا لیکن کارسازِ ازل کی عدالت میں انصاف اُس کا ہوگا۔ کیونکہ وہ مردِ حق آگاہ حق پرست تھا۔ بہ قولِ خود اس کے ؎

آج ہے زور و شور باطل کا
پھر بھی دل حق پرست ہے ساقی

دراز قد۔ لمبا تڑنگا آدمی۔ اپنے درازی قد پر کیا خوب فرمایا ہے۔

وہ سرو اگر ہیں تو سفیدہ ہی میں سہی
کیوں ہو کسی کُد کہ میں قدِ کشیدہ ہوں

چال میں ڈھیلا ڈھالا۔ بالوں پر حجام نے جس انداز سے بے ردیف و قافیہ شاعری کی تو کی۔ لباس نہ میلا نہ صاف بلکہ روشِ زمانہ سے بہت دور بالکل بے تکا سا۔ لیکن مزاجیہ رنگ میں اس بے تکاپن کے طفیل حضرت شوریدہ کیا پر لطف اور پُرمعنی قطعہ فرما گئے ؎

توڑ دی پڑھ کر نماز اُس کی کریز
میں نے پتلوں کو مسلماں کر دیا

پائجامہ کرکے ہی چھوڑا اسے

رام شاید نفسِ شیطاں کردیا

قطعہ کا آخری مصرعہ جانِ قطعہ ہے۔ چہرہ کتابی تو تھا لیکن کُلیتاً نہ ایسا کہ حسینانِ شہر متوجہ ہوں۔ رنگت ہی بے آب ہو تو شاعر کوئی کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ محبوب کو خط پیش کرے تو طمانچہ ہی جواب ہوگا۔ اس پر اگر لہجہ بھی کرخت ہو اور دہانہ چوڑا تو کیا بات بنے۔ شوریدہ کا بے ڈول سراپا ذہن میں لائیے تو شاید یہ ایک شاعر کا سراپا نہ ہوگا۔ ان کی گفتگو۔ اُن کی وضع قطع بلکہ اُن کے لائف سٹائل میں ہی کوئی ایسی بات نہ تھی کہ جس سے پتہ چلے کہ اس دیہاتی کھردرے حلیہ کے اندر ایک شیریں بیان شاعر ہے۔ اُن کا کریہہ ظاہر ان کے جمیل باطن پر ایک پردہ تھا۔ خود فرماتے ہیں ؎

حسینوں سے حسین تر ہے دل اپنا

بہ ظاہر نور کا پیکر نہیں ہوں

ان کی اصل صورت وہ نہ تھی جو وہ دِکھتے تھے۔ ضروری تھا کہ پردے کو ہٹا کر جھانک لیا جائے تاکہ اصل شوریدہ کو دیکھ لیا جائے اور وہ کتنا خوبصورت تھا کیونکہ وہ سچا تھا۔ تصنع سے بالکل پاک۔ غرور حیاتِ فانی سے مبرا۔ کمال فن کا حامل شاعر لیکن انا طمطراق سے خالی۔ بس ایک پیکر صدق و صفا جو اپنے مولا کا طاعت گذار بندہ تھا۔ بالکل سیدھا سادہ۔ وہ ساگر علم کا غواص تو تھا۔ لیکن دنیا میں زندگی جس سے عیش و آرام سے کٹے وہ داؤ پیچ چلانے والی عقل اُس کے پاس نہ تھی۔ وہ گذری صدی کے شاعروں جیسا شاعر تھا۔ وہی جذب صادق، وہی لہجہ، وہی راز و نیاز، وہی سوز و گداز بس وہی دل کو تراوت بخشنے والی شاعری ؎

دیدنی ہے کتاب کائنات

فطرت حق نے بھی کی ہے شاعری

دل نشین فطرت کی ہے ہر ہر ادا
شاخ گل کی تھرتھری ہے شاعری

یہ ہے شوریدہ۔ شاعر رنگین بیان۔ جو کتاب کائنات کو فطرت حق کی شاعری کہتا ہے اور شاعری کو شاخ گل کی تھرتھری۔ اگر نقادِ فن ستم نہ کرے اور نبض رنگ و بو کو کانٹوں سے نہ چھوئے تو شوریدہ کی شاعری میں اس سے سراہنے کو بہت کچھ ملیگا۔

سادگی اس شاعر شیرین زبان کی شخصیت کا طرّہ امتیاز تھی اور اس پُرسوز سادگی کا پرتو تو کلام میں بھی موجود ہے۔ سادگی صوفیانہ زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ صوفیا اظہار سادگی کے لئے ہی صوف پہنا کرتے ہیں۔ شوریدہ فرماتے ہیں ؎

زیب تن صوف ہے اب بھی لیکن
صوفیہ دل کی صفا بھول گئے

جدید زمانے کے ایک عالم دین سید حسین نفر کا خیال ہے کہ سادگی فرد کو جنت کی طرف لے جاتی ہے جبکہ حشمت اس کو جہنم کے راستے پر ڈالتی ہے۔ لیکن کاروبار حیات میں ہم میں سے اکثر سادگی کو بہ نظرِ حقارت رد کرتے ہیں اور حشمت کو ہی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ سادگی ہی ہے جو بجائے حشمت کے اس معصومیت اور حرمت کے زیادہ نزدیک ہے کہ جو حسن ملکوتی کا خاصہ ہیں۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ نے کہا ہے کہ ہمیں جنت میں داخل ہونے کے لئے بچوں کے جیسا ہونا چاہیئے۔ زور بیان کے تاثر کو قائم رکھنے کے لئے مناسب ہے کہ نفر کے ہی الفاظ میں اس کے خیال کو پیش کیا جائے۔

MANY TO DAY WOULD LIKE TO BE SOPHISTICATED AT ALL COSTS, EVEN PREFERRING TO BE SOPHISTICATED AND ENTER HELL THAN BE SIMPLE AND GO TO PARADISE, NEVERTHELESS THE STATE OF SIMPLICITY IS CLOSER, THAN

THAT OF SOPHISTICATION, TO THE INNOCENCE AND PURITY WHICH IS THE CONDITION OF CELESTIAL BEAUTITUDE, FOR AS CHRIST SAID 'WE MUST BE LIKE CHILDREN IN ORDER TO ENTER HEAVEN.

شاعر شوریدہ توحد سے زیادہ ہی سادہ تھا۔ مجاز سے حقیقت تک کا راستہ ہر سالک کی طرح اس نے بھی طے کیا۔ ایک بت طناز سے عشق کیا اور کس سادگی کے ساتھ۔

ہائے یہ معصوم تمنا ؎

مفت بھی میں اُنہیں نہیں منظور
اے خدا کیا میرے نہیں کچھ دام

اب محبت کا ہے یہی مقصد
دیکھنا چاہتا ہوں بس انجام

ہوگی تکمیل میری الفت کی
وہ صنم جب کرے قبول اسلام

اُس نے جوانی میں سادگی برتی۔ کالج کس شانِ سادگی کے ساتھ آتے تھے پروفیسر شوریدہ۔ وہ اس زمانے میں بھی درویش لگتا تھا۔ بس اپنے ہی خیالات میں مگن۔ اشعار کی تشریح بھی سیدھے سادھے الفاظ میں کیا کرتے۔ وہ پُرگو نہیں تھا۔ ایک دلنواز تمکنت میں رچی بسی پُروقار سادگی شوریدہ کی شخصیت میں موجزن تھی۔ زمانے کے انداز چاہے کس طور بدلیں۔ وہ اپنی روشِ سادہ ہرگز نہ چھوڑیں۔ لباس سادہ، وضع قطع سادہ، گفتگو سادہ، سر پر ٹوپی وہ بھی سادہ سی اور سادہ سی ہر ہر ادا۔ اس سادگی پر ہزار وضع داری، ہزار طرحداری، ہزار کج کلاہی نچھاور کہ جو مرحوم شوریدہ کی شخصیت کا حصہ تھی۔ امارت و ثروت سے وہ کبھی مرعوب نہ ہُوا۔ شہرت سے دور وہ بھاگا۔ ارباب اختیار کی دہلیزوں پر جبہ سائی

اُس نے نہ کی کیونکہ وہ خود دار تھا۔ وہ خوددار تھا کیونکہ وہ ایک شاعر تھا۔ وہ غریب تو تھا لیکن شاعری کا سوداگر نہیں۔ اُس نے غریبی میں شان پیدا کی۔ یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

بارِ احسان اُٹھا نہیں سکتی
اتنی نازک ہے مفلسی میری

دل ہے شوریدہ ساغرِ سرشار
چھلکی پڑتی ہے سرخوشی میری

اسی مضمون کو بہ انداز دیگر یوں باندھا ہے ؎

جس کو کہتے ہیں لکشمی دیوی
سُن کے آہٹ میری سٹکتی ہے

بقول مظہر امام، شوریدہ مزاجاً صوفی صافی تھے۔ نہ ستائش کی پروا، نہ صلے کی تمنّا۔ نامساعد حالاتِ زندگی اور تلخیٔ شب و روز کے باوجود لب پر حرفِ شکایت نہیں۔ وہ زخم کھاتے رہے اور مسکراتے رہے۔ شاید یہ ایک فطری اصول ہی ہو کہ شاعر جتنا تباہ حال ہو اتنا ہی پُرسوز اور اثر آفرین ہوتا ہے۔ انگریزی ادب کے شاعر شیلی نے سچ ہی تو کہا ہے ؎

OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE WHICH TELL
OF SADDEST THOUGHT.

لیکن یہاں تو معاملہ ذرا الٹ ہے اور وہ یہ کہ تلخابۂ حیات تلخ ترین ہونے کے باوجود کلام میں قنوطیت نہیں بلکہ ایک خوشگوار رجائیت ایک ہلکی پھوار موسم بہار کی۔ کلام میں جاری و ساری ہے۔ وہ لفظ صوفی کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں صوفی نہ تھا البتہ صوفی مزاج ضرور تھا۔ وہ رزم گاہ حیات میں تا دمِ آخر ستیزہ کار رہا۔ لیکن حزن و ملال اس کے دل میں پیدا نہ ہوا۔ تلخابۂ حیات کیفیت وہ پیدا کر گئی جو شعر کے سانچے میں

ایک دوسرے ہی انداز میں ڈھلتی چلی گئی ؎

صفا ہوتی ہے شوریدہ جب اپنے قلب میں پیدا
تو ہر صورت جہاں کی بھولی بھالی ہوتی جاتی ہے

قلب کی یہ صفائی صوفیا کا ہمیشہ سے ہی گوہر مقصود رہا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو سلوک و ریاضت کے کٹھن مقامات سے گزر کر وہ حاصل کر گئے اور پھر ماحول کی تاریکی کو روشنی میں مبدل کر گئے۔ ایک سچے صوفی کی طرح شوریدہ باصفا تھے۔ عشق کے مضراب سے ہی اُس کے کارِ حیات کا نغمہ وزید تھا ؎

کیا کہوں دل ہے کس کا دیوانہ — جو یگانوں میں بھی یگانہ ہے
ذوقِ سجدہ میں پھر جھکا ہے سر — سجدۂ سہو بھی اک بہانہ ہے

وہ نگاہ مست و الست کے ساتھ ساتھ دل پاکباز کا بھی حامل تھا۔ ورنہ ایک شہر بے چراغ ہو۔ جہاں بوالہوس تہذیب کو اپنے ہی معنی پہنا رہے ہوں۔ شائستگی روندھی جا رہی ہو۔ اخلاق، مروت اور خوبی کی قدروں کو پامال کیا جا رہا ہو۔ یہاں تک کہ کار پردازانِ علم و ادب بھی نیلام ہو رہے ہوں تو قلب انسانی میں کدورتوں کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس عاشق پاکباز کو اپنی صافیٔ دل کی وجہ سے ہر صورت جہاں کی بھولی بھالی نظر آتی ہے اور یہی صوفیانہ طرز زندگی کی معراج ہے۔ انگریزی کے (MYSTIC POET) ورڈس ورتھ بہ زبان شاعری یوں رقمطراز ہیں ؎

THANKS TO THE HUMAN HEART BY WHICH, WE LIVE, THANKS TO ITS TENDERNESS, ITS JOYS AND FEARS, TO ME THE MEANEST FLOWER THAT BLOWS CAN GIVE THOUGHTS THAT TOO OFTEN LIE TOO DEEP FOR TEARS.

محرومیوں کے باوجود شوریدہ اطمینانِ قلب کی تصویر تھا۔ اس نگارخانۂ شیشہ و اصنام

یں سے کس تمنائے خام سے اس کا دل نہ للچایا۔ زمانے نے اُس کو بہت ستایا لیکن خود وہ بے ضرر تھا۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں ـــــ دونوں ایک ساتھ اُس کے دِل نازک پر نازل ہوتے رہے۔ لیکن ہر ایک لہر غم اس کے صحرائے خیال کو یوں رقصاں کرتی چلی گئی ؎

ضربتِ غم ہے دمبدم دل پر
اور تن تن رباب کی سی ہے

وہ ہر حال میں مُطمئن نظر آتا تھا۔ بے نیازی اُس کے بشرے سے چھلکی پڑتی تھی۔ اُس نے نفسِ امارہ کو رام کر لیا تھا۔ نفسِ امارہ سے نفسِ مطمئنہ تک کا سفر ایک سالک کے لئے آسان نہیں۔ یہ خواہش نفس کے آہوئے رم خوردہ کو رام کرنے کا فن ہے۔ خواہش نفس کو قابو میں لانا اور اعتدال اور صبر و قناعت کی زندگی گذارنا ہی وہ چیز ہے کہ جسکو فن حیات یعنی ART OF LIFE کہا جائے۔ غور کیجئے تو کفار مکہ نبی برحق ؐ کے حیات بخش پیغام کے اس حد تک کیوں مخالف ہوئے۔ چراغ مصطفوی ؐ سے شرارِ بولہبی کیوں ستیزہ کار رہا۔ یہاں بھی کار شیطان کا محرک انسان کی غلامیٔ نفس ہی ہے۔ سُورہ فرقان میں قرآن مجید میں یُوں آیت آتی ہے ؎

اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰاہُ اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْہِ وَکِیْلًا۔

"تیرا کیا خیال ہے اس شخص کے متعلق جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔ کیا تو اس کی ذمہ داری لے سکتا ہے (ترجمہ مودودیؒ)

صحیح کہا ہے حُسین نصر نے کہ یہ مقام اسفلہ سافلین سے مقام احسن تقویم تک کا سفر ہے۔ کتنے ہی پُر پیچ مراحل ایسے آتے ہیں کہ جہاں کوئی قدم غلط پڑا تو ساری ریاضت اکارت چلی جائے۔ استاد ذوقؔ فرماتے ہیں ؎

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا

اور شوریدہ نے کہا — حیاتِ ارضی تو ہجوم خواہشات سے عبارت ہے اور پھر بقول غالب۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا۔ ہوس کی ستم رانی سے ہی کوئی سالک مقامات میں ہی کھو جاتا ہے اور وہ لطف و انبساط، سرفرازی و سرشاری کے اس مقام پر نہیں پہنچ پاتا جہاں نفس مطمئنہ کی دولت بے بہا ہاتھ آتی ہے۔ اس اعلیٰ و ارفع مقام ہر سالکِ جانگداز ہر واہمے اور ہر وسوسے سے آزاد ہوتا ہے۔ سپردگی کا یہ وہ عالم ہوتا ہے کہ بندہ زندانی جہانِ آب و گِل ہوتے ہوئے بھی شش جہت کی سرحدیں عبور کرتا ہے۔ حیات کے روزنوں سے عالم ایجاد کو وہ اپنی ذات کے کشکول میں کب کا سمیٹ چکا ہوتا ہے اور وہ ارضیت کی خمیر میں سے اٹھا ہوا ایک مشتِ غبار ہونے کے باوجود راہی عالم ماورا ہوتا ہے۔ یہ شعر ایک ایسا ہی تخیل موزوں کر سکتا ہے جس کے ہم رکاب قلبِ مطمئنہ ہو:۔

میرے شہباز کے دو پر تخیل اور تصور ہیں
ثریٰ سے ابتدا کر کے ثریا سے گزرتا ہوں

میرے جنوں کے واسطے تنگ تھا عرصۂ جہاں
پھاند کے یہ نکل گیا سرحد شش جہات کو

شاہد راز نے کیا مجھ کو شہید جستجو
پنجۂ شوق چاک کر پردۂ کائنات کو

ہے عرشِ اعلیٰ اک زینہ جس کا
کیا کہیئے کس جا ہے دل کی منزل

ان اشعار میں شاعر شوریدہ کے پر مرغِ تخیل کی رسائی داد طلب ہے۔
ندرتِ مضمون آفرینی کا حامل یہ شعر سن لیجئے ؎

مصحفِ روئے یار کی اللہ ہر تلاوت جدید ہوتی ہے

شاعر کا محبوب اس شعر میں وہی فن کار ازل ہے جو یکہ و تنہا حسن لازوال کا حامل ہے۔ مگر مجاز اور حقیقت کا یہ اتصال اللہ اللہ۔ وضاحت و بلاغت میں شوریدہ کی شاعری کم نہیں۔ یہ رُباعی ملاحظہ ہو ؎

سرچشمہ فصاحت کا زبان سے چھوٹا
فوارہ بلاغت کا قلم سے چھوٹا
کوثر میں دُھلی جو میری اردو دیکھی
ہندار و غرور اہل زبان کا ٹوٹا

اور پھر عجز و انکساری کا یہ عالم ؎

خوشا کلام بلاغت نظام شوریدہ
مگر قتیلِ کلامِ مجید ہوتے ہیں

پروفیسر شوریدہ کی ناچیز کے ساتھ ایک ملاقات ناچیز کے ذہن پر نقش ہے۔ ناچیز نے سوال کیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ غبار خاطر میں ابوالکلام آزاد ہر ہر پیرگراف کے بعد برجستہ کوئی شعر تحریر کرتے ہیں تو اقبال کا کوئی شعر اس فن پارۂ نثری میں کیوں نہیں جبکہ دونوں باکمال ہمعصر بھی تھے۔ اس پر گفتگو کا موضوع ہی اقبالؔ اور آزادؔ ہوئے اور پھر اس نے کہا۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اقبال کے زیر اہتمام اقبالؔ پر سیمنار میں بولتے ہوئے ایک مقالہ نگار نے یوں خیال آفرینی کی " اگر قرآن نہ ہوتا تو ابوالکلام کی نثر اور اقبالؔ کی شاعری۔ یہ دو چیزیں بس کافی تھیں" اس خیال کے جواب میں، مَیں نے کہا کہ اگر قرآن نہ ہوتا تو نہ ابوالکلام ہوتے اور نہ ہی اقبالؔ " کیا لاجواب بات ہے لوگو۔ دونوں کی فکر کا سرچشمہ قرآن ہی تو تھا۔ آگے صاحب فکر شوریدہ یوں گویا ہوئے " میں جب ابوالکلام کو پڑھتا ہوں تو اقبالؔ کو بھول جاتا ہوں اور جب اقبالؔ کو پڑھتا ہوں تو ابوالکلام کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہ جاتی " ہائے میرے بنجر گاؤں میں ایک ہی تو سرو تھا جن کے پہلو

میں، میں گاہ گاہ بیٹھا کرتا تھا۔ شوریدہ کے بحرِ علمی میں اپنی کم مائیگی کا علاج تلاش کرتا تھا۔ ایک اور بات حافظے سے چلی آتی ہے۔ کتنی سادہ مگر کتنی سچ !

شوریدہ کی تربیت ذہنی میں دانش گاہ علیگڈھ کا خاصا حصہ ہے۔ یہاں وہ پروفیسر آل احمد سرور جیسے نقادِ فن سے دادِ سخن حاصل کرتے اور ایک اور صوفی صافی قدآور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خیالات سے مستفید ہوئے۔ کالج میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ہی کوئی مضمون پڑھاتے پڑھاتے یہ بات کہہ گئے۔" میں نے علیگڈھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی سے پوچھا :۔ جناب ایک اچھا شاعر کون ہوتا ہے۔ حاضر جوابی کی داد دیجیے کہ پروفیسر موصوف فی البدیہہ یہ جواب دے گئے۔ 'ایک اچھا انسان ہی ایک اچھا شاعر ہو سکتا ہے" ایک اچھے شاعر کی یہ جامع تعریف ہے۔

شوریدہ ایک اچھا انسان تھا اور اس لئے ایک اچھا شاعر! اُس کی نظر میں شاعری نہ صرف مثبت قوتوں اور قدروں کی ترجمان ہے بلکہ قلبِ انسانی میں ان کی محرک بھی۔ انگریزی ادب کے نقاد میتھو آرنلڈ کا نظریہ یہ ہے کہ شاعری تنقیدِ حیات ہے اور شوریدہ کا نظریہ شاعری بس یہ ہے ؎

شوریدہ ہے شاعری تری کیا
ہنر و حق و حسن کی ادا بند

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ہی یہ مشہور قول ہے کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ جدیدیت کیا کیا نئی چیزیں لائے لیکن اردو شاعری میں غزل ایک قدیم صنف ہونے کے باوجود ہمیشہ پُر بہار رہیگی۔ زمانہ جدید ہوتا چلا جائے تو یہ بھی جدید ہوتی چلی جائے۔ لیکن کامیاب تجربے وہی ہونگے جو روایت سے یکسر بغاوت کر کے نہ کئے گئے ہوں۔ شعری پیکر نئے تو ہوں لیکن مشرق کا شاعر علامتیں، استعارے اور محاورہ غرضیکہ ہڈی کے اندر مغز (MARROW) وہی تو رکھے کہ جو مشرق کا اپنا ہے۔ وگرنہ جدیدیت

اپنی جلو میں وہ ابہام لائے جو روحِ شعر کو ہی مجروح کر دے اور علامتیں وہ کہ جن سے فنونِ لطیفہ کی حسین و جمیل شہزادی یعنی کہ شاعری کی آرائشِ جمال تو کیا اس کی نازک کلائی ہی مروڑی جائے۔ بہ قول ایک ناقد کے مطالب و مفہوم میں وسعت پیدا ہو بھی جائے لیکن حسن، شعر اور اس کی رمزیت اور موسیقیت پر کاری ضرب پڑیگی۔ 'کوہ کندن کاہ بر آوردن' کے مصداق جدید شعری تخلیقات میں سے دماغ سوزی کے باوجود قاری کے ذہن میں بہت کم باتیں آجاتی ہیں۔ ان میں تعقل کو اس حد تک ٹھونس دیا گیا ہے کہ شعریت ہی شاعری سے عنقا ہوتی چلی گئی۔ شوریدہ بھی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کا شعری رویہ اردو شاعری کے اساتذہ اول ہی کے جلو میں صورت پذیر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ خواجہ میر درد، میر تقی میر، غالب اور اقبال۔ یہ چاروں ان کے اُستاد ہیں۔ پھر بھی ان کا اپنا ایک رنگ ہے۔ رودِ جدیدیت کے بہاؤ میں اکثر باکمال فن کار مغربی رنگ اختیار کر گئے لیکن شوریدہ وہی خوبصورت رنگ پھر لے آئے جس سے اردو کا کلاسیکی ادب مزین ہے۔ ان کی اپنی ایک انفرادیت ہے اور اپنا ایک مقام۔ اثر پذیری ایک مثبت قوت ہے۔ اگر فن کار ORIGINALITY کا حامل ہو۔ شوریدہ کی دکانِ شاعری میں اس کا اپنا مال ہے۔ وہ اوریجنل ہے۔ "شہر میں کھولی تھی اس نے دکان سب سے الگ" بہار باغ کا ثمر کے قصیدہ خوان بہت سے شاعر ملینگے۔ لیکن زمہریری زمستان کا ثمر کا وہ واحد نغمہ خوان ہے۔ چھوٹی بحریں طویل نظم نیرنگ زمستان روانی، سلاست اور محاکات میں شوریدہ کے فن شعر پر قدرت رکھنے کی غماز ہے۔ ہنگامۂ شام ایک اور مختصر مگر حسین نظم ہے۔ شوریدہ کی ساری کی ساری شاعری ایک گلریز وادی میں ایک مترنم، تھرکتی جوئے آب کے نغمۂ دلکشا کا احساس دلاتی ہے۔ خاص الخواص چیز رہی آبروئے اردو شاعری یعنی کہ غزل ہے اور غزل میں وہ حلاوت وہ سوز و گداز،

وہ بانکپن اور وہ سادگی موجود ہے جو خواجہ حسن نظامی کے نثر فن پارہ دسی پارہ دل، میں ہے۔ شوریدہ کی شاعری میں زبردستی تعقل کو نہیں ٹھونسا گیا ہے اور نہ ہی اس میں آپ کو فلسفہ اور مٹافزیکس کی مبادیات سے دست درازی ملیگی۔ بس خالص انسانی تجربے ہیں جن کو فصاحت میں ملبوس زبان سادہ میں شاعر نے پیش کیا ہے۔ محاسن فن پر شوریدہ کو قدرت حاصل ہے اور ان کو اپنی شاعری میں برت بھی لیتے ہیں۔ ہلکی پھلکی غنائیت اور آہنگ سے شوریدہ کی شاعری میں تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور اس وجہ سے یہ شاعری دل کو بہت پیاری لگتی ہے۔ جو شاعری جذبے کو آسودہ نہ کرے بلکہ محض تعقل کی بنیاد پر فلسفہ آرائی اور یہاں تک کہ معقولات میں بھی قدم رنجہ فرمائے، کچھ اور تو ہو سکتی ہے مگر فنون لطیفہ کی چیز نہیں۔ جدید شاعری تعقل پر زیادہ انحصار کرتی ہے۔ جذبے پر کم۔ غیر متوازن تعقل سے شاعری بھاری بھر کم تو ہوئی لیکن اس میں جذبہ کے دب جانے سے پھیکاپن پیدا ہو گیا ہے۔ انگریزی کے شہرہ آفاق شاعر ورڈس ورتھ جذبہ کے حوالے سے ہی شاعری کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری بس لمحۂ طمانیت میں جذبے کی بازیافت ہے۔

POETRY IS EMOTION RECOLLECTED IN TRANQUALITY.

شوریدہ کے تخلیقی عمل کا محرک بس وہی جذبِ صادق ہے کہ جو جانِ شاعری ہے۔ ان کا فن سچائی کا آئینہ دار ہے اور اس لئے خوبصورت! اپنے شعری سفر میں انہوں نے کبھی فیشن پرستی نہ کی اور نہ کبھی نعرہ بازی سے متاثر ہوئے۔ میرے نزدیک ان کی شاعری لازوال ہے کیونکہ سچ لازوال ہے۔ شوریدہ ایک جگہ لکھتے ہیں، میں ادب برائے زندگی کا اس شرط کے ساتھ قائل ہوں کہ ادب پہلے ادب ہو اور پھر زندگی۔ اس میں صداقت و خلوص، جذبہ و فکر کا حسین امتزاج اور ایک طرح کا قدرتی بہاؤ ضرور ہونا چاہیئے۔ پھر تاثیر کا کیا کہنا۔ اب ذرا ان اشعار کی روشنی میں شاعر کے اپنے

مقرر کردہ معیار پر اس کو جانچیئے ؎

دل میں آتا ہے یار کا ابرو
جب فلک پر ہلال آتا ہے

وہ تو اِک داغِ دل ہمارا تھا
ان کی مژگان پہ جو ستارا تھا

چشم ساقی کا وہ پیام و کلام
استعارہ در استعارہ تھا

خنداں جنون تھا اہل جنوں کا ناگہ جب اُٹھا شور سلاسل
راہ میں بخذ بھی ہے طور بھی ہے اس نشیب و فراز نے مارا
مے نشان ازل کو شوریدہ مئے ناب حجاز نے مارا
رات ہے تارے جھلملاتے ہیں داغ بھی دل کے جگمگاتے ہیں
چاپ سنتے ہیں چاند کی شاید جانے کیوں تارے تھرتھراتے ہیں
دل کے زخموں پر رکھتے ہیں پھاہا نرم جھونکے ہوا کے آتے ہیں

افسوس کہ شوریدہ کی وہ پذیرائی نہ ہوئی جو ہونی چاہیئے تھی۔ جیتے جی ان کی طرف خال خال ہی کوئی متوجہ ہُوا۔ اور یارانِ نکتہ دان کو اپنی طرف متوجہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ کاروان علم وادب کا ایک نرالا رہرو تھا۔ وہ اکیلا ہی چلا۔ گرمیٔ ہنگامۂ محفل سے دور بہت دُور۔ وہ اپنی ہی خلوت میں غم یار کے آتش پرسوز سے اپنے دل کو داغ داغ کرتا رہا۔ اور یوں اس کی خلومیں دل کے داغوں سے فروزاں ہوتی رہیں۔ وہ ناصر کاظمی کے اس شعر کا مظہر تھا۔

اس شہرِ بے چراغ میں جائیگی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

وہ رندِ لا اُبالی تھا۔ پیشہ ور ادیب نہ تھا اور نہ ہی محفل کو گرمانے والی رنگین مزاجی اُس میں تھی۔ وہ شرافت گزیدہ سر پر کلاہ تتری رکھنے والے کج ادا ارباب محفل سخن وراں میں MALADJUSTED تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"بے ادبی کی ہزار بار معافی چاہتے ہوئے ادب کے ادنیٰ طالب علم اور شیدائی کی حیثیت سے یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ کسی ایک ملک کے ادب وزبان کا سوال نہیں دُنیا کی بہت سی زبانوں اور ادب کے علم برداروں کی شروع سے یہ کمزوری رہی ہے کہ جو ادیبوں کی وردی پہن کر اور دین و اخلاقیات سے رشتہ وناطہ توڑ کر ان کی بزم میں نہیں آیا اس کو انہوں نے یا تو محفل میں آنے کی اجازت نہیں دی یا بادلِ ناخواستہ جگہ دی۔ ادب جس کو تقلید و روایت پرستی سے سب سے زیادہ انکار اور لکیر کا فقیر بننے سے سب سے زیادہ عار ہونا چاہیئے تھا اور جس کے ضمیر و سرشت میں حدت و جرأت۔ ذہانت ذوقِ جمال اور ادب کی زبان میں حسن پرستی داخل ہے اور جس کو بلبل کی طرح ہر گل کا شیدا اور ہر مظہر جمال اور کمال کا شیفتہ و فریفتہ ہونا چاہیئے۔ اکثر موقعوں پر روایت پرست، تعصب کا شکار اور رسم ورواج میں گرفتار نظر آتا ہے"۔

اور یہی معاملہ ارباب اہل فن نے شوریدہ کے ساتھ روا رکھا۔ وہ ایسے منظر پر آتا جبکہ وہ مخصوص چولا پہننا اُس سے قبول نہ تھا جو محفل سخنوراں میں جگہ پانے کے لئے پہننا ضروری تھا۔ لیکن موت کے بعد وہ سب کو یاد آئیگا۔ اس کی شاعری پر کام کیا جائیگا۔ ایوانِ ادب میں وہ اپنی نشست ضرور پائیگا۔ لیکن ؎

محفلِ زنداں میں جب موجود شوریدہ نہ تھا
مغ بچے آئے تو کیا پیرِ مغاں آیا تو کیا

اس کی موت پر اس کا اپنا ہی ایک شعر کس قدر صادق آتا ہے ؎

پاؤں پاؤں چلینگے اب کب تک
کوچۂ یار میں بر سر جائیں

جو کہا سو کیا —— وہ کوچۂ یار میں برسر ہی چلا گیا ؛

تعزیتی پیغام

شوریدہ صاحب کی اچانک وفات کی خبر سُنکر میں سناٹے میں آگیا، اُن سے میری دیرینہ شناسائی تھی، سادگی اُنکی روزمرّہ زندگی کا شعار تھی لیکن وہ ایک رنگین مزاج اور قادرالکلام شاعر تھے، کچھ لوگ شعر کہکر ظلم کرتے ہیں، لیکن شوریدہ صاحب اگر شعر نہ کہتے تو ظلم کرتے، وہ فنافی الشعر تھے، اساتذہ کی شاعری کا بہت اچھا مطالعہ کیا تھا، اور اپنے ذوق سلیم کی بدولت اُنہیں اردو زبان بیان اور محاورے پر عبور حاصل تھا، اسی لئے اُنکا اردو شعر کشمیری شعر کا ترجمہ نہیں لگتا، اساتذہ کی زمینوں میں جو غزلیں کہی ہیں، وہ خوب ہیں، ایک بار ہم شیر باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے، کہنے لگے کہ میر درد کی زمین میں غزل کہی ہے میں نے فرمائش کی کہ غزل ارشاد ہو مطلع سُنایا

درمیانِ دل و جگر دیکھا　　کیا کہوں یار کو کدھر دیکھا

میں جھوم اُٹھا، شعر کا والہانہ پن اور جوشِ بیان قابل داد ہے، ایسا شعر صرف ایک فطری شاعر ہی کہہ سکتا ہے، شوریدہ صاحب نے غزل کے علاوہ مثنویاں بھی لکھیں اور ارباب فن سے دادِ سخن حاصل کی، رباعی کی مشکل صنف میں بھی طبع آزمائی کی، رُباعی کے وزن میں اچھے اچھوں نے ٹھوکر کھائی ہے مگر شوریدہ صاحب نے یہاں بھی اپنی مشّاقی کا ثبوت پیش کیا، اور اِس مرحلہ سخت سے آسان گزر گئے، مزاح اور طنز کی ایک زیریں لہر بھی اُنکے کلام کی ایک خصوصیت ہے، اساتذہ میں وہ میر درد سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، اِس لئے کہ وہ طبعاً ایک درویش صفت صوفی صافی تھے، اِس زمانے میں جب لوگ نام و نمود اور ظاہری آرائش کے پرستار ہیں، شوریدہ صاحب بے نیازی، بے ساختگی اور سرمستی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے، ایسے لوگ اب خال خال ہی نظر آتے ہیں جو اپنے آس پاس سے بے نیاز اپنی الگ دُنیا بسائے، زندگی گزار رہے ہوں، کشمیر بہت عرصے تک اپنے اِس سپوت کو یاد کرے گا،

خاک پاکِ وطن ہے مردُم خیز
یہی شیراز ہے یہی تبریز　　(شوریدہ)

(قاضی غلام محمد)

خراجِ عقیدت

منجانب اہالیان نئی بستی، اسلام آباد

معزز اراکین اقبال اکیڈمی، اور معزز حاضرین مجلس

السلام علیکم

ہم اہلِ نئی بستی اقبال اکیڈمی کے معزز اراکین کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے آج ہماری نئی بستی کو اپنی آمد سے رونق بخشی ہے آپ کی آمد سے ہمیں آج اس بلند مرتبہ اردو شاعر کی عدم موجودگی کا احساس دو چند ہو رہا ہے۔ جس نے ہماری بستی کے نام کو وادی کے طول و عرض میں روشن کیا ہے اگرچہ مرحوم شوریدہ صاحب کی جائے پیدائش وادی کا مشہور و معروف قصبہ شوپیان تھا مگر مرحوم نے اپنی ادبی زندگی کا بیشتر حصہ اسی نئی بستی میں بسر کیا ہے۔ تمام اہل بستی آپ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ آپ اکثر ہماری مسجد میں اسلامی اقدار۔ اسلامی کردار اور موضانہ زندگی پر روشنی ڈالا کرتے تھے۔ مرد مسلمان کا تذکرہ کرتے ہوئے اکثر علامہ کا یہ شعر دہراتے تھے ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

آپ نے کبھی بھی وادی کے کسی بھی فرعون اور آمر کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکائی۔ آپ اگرچہ اسی بستی میں ایک مانے ہوئے عابد و زاہد اور صوم و صلواۃ کے پابند مردِ مومن تھے مگر آپ اپنی بڑائی کا کبھی بھی کسی طرح سے اظہار نہیں کرتے تھے۔ ریاکاری۔ مکاری اور عیاری سے آپ

بالکل ناآشنا تھے۔ اپنے ادبی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہا کرتے تھے علامہ اقبال کی ضرب کلیم کے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس مجموعہ کلام میں علامہ کی بعض نظمیں اس قدر بلند پایہ ہیں کہ اُن کی سرحد الہام سے ملی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے تھے ضرب کلیم علامہ کی پختہ عمر کا کلام ہے اس لئے قدرتی طور پر اس میں خیالات کی گہرائی اور پختگی نظر آتی ہے اس کتاب میں علامہ نے دُنیا کے تمام مسایل پر اسلامی زاویہ نگاہ سے تنقید فرمائی ہے اردُو یا فارسی میں کوئی اور کتاب علامہ کی اس پایہ کی نہیں ہے۔ شوریدہ صاحب اکثر فرماتے تھے کہ ضرب کلیم ڈاکٹر اقبال کے قول کے مطابق دورِ حاضر کے خلافِ اعلانِ جنگ ہے ایک دن اپنی بیٹھک میں باتوں باتوں میں یوں گویا ہوئے۔ اقبال کا کمالِ فن یہ ہے کہ اُن کی شاعری میں تفصیل اور اجمال دونوں پائے جاتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جس بات کو اظہار کرنے کے لئے پوری کتاب لکھنی پڑے اُسی بات کو علامہ دو شعروں میں بیان فرماتے تھے دریا کو کوزے میں بند کرتے تھے۔ چونکہ علامہ کو قرآن حکیم سے گہرا متعف تھا۔ جسکی وجہ سے انہوں نے یہ فن سیکھا ہوگا۔ شوریدہ صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے رہتے ہیں۔ شاعری اِن کی زندگی کا جُز تھی مگر ہم لوگوں کو افسوس اس بات پر ہے کہ ہم اُسکی صحبت کا زیادہ دیر تک فایدہ نہ اُٹھا سکے۔ جب آپکی شاعری چمکنے والی تھی اور آپ جیسے قدردان انکی شاعری کی داد دینے لگے تھے تو شوریدہ صاحب اس دارِ فانی سے اُٹھ گئے۔ بہرحال بقولِ کسی شاعر کے بہت آگے گئے۔ باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنتِ فردوس عطا کرے آخر پر ہم اہل نئی بستی پھر اقبال اکیڈیمی کے بزرگ اور نوجوان معزز اراکین اور حاضرین مجلس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس پُروقار مجلس میں شرکت فرمانے کی زحمت برداشت کی ہے۔ ❊

مومن آباد، اِسلام آباد کشمیر
۸ ستمبر ۱۹۹۱ء

جناب بشیر احمد نحوی صاحب
سیکرٹری "اقبال اکیڈیمی"

اَلسّلام علیکم !

بَس میں آپ کی ملاقات تپتے ریگذار میں صاف اور ٹھنڈے پانی سے بھرے اُس گلاس کی مانند تھی جسے میں سرینگر تک کے تھکا دینے والے سفر میں گھونٹ گھونٹ پینا چاہتا تھا۔ لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہماری مسافر بسوں کے کانوں کو پھاڑ دینے والے شور و ہنگامہ میں اپنی بھوک پیاس کا کِسے ہوش رہتا ہے۔ پس ایک گھنٹہ تک آپ کے قریب ہونے کے باوجود میں اپنی تشنگی نہ مٹا سکا ــــ یقین کیجئے میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں کیوں کہ میں آپ کو اپنے علاقے کا ہی نہیں بلکہ اپنی ریاست کا ایک پُرخلوص عالم اور دانشور مانتا ہوں اور آپ کے حافظے کو بطور مثال پیش کیا کرتا ہوں۔

بہر حال آپ کی زبانی یہ خبر سُن کر مسرّت ہوئی کہ 'اقبال اکیڈیمی' مرحوم شاعر پروفیسر شوریدہؔ کاشمیری کی یاد میں ایک کِتاب اجرا کر رہی ہے۔ میں شوریدہؔ مرحوم کو قریب سے جاننے کا دعویٰ تو نہیں کرتا البتہ اُن کے ساتھ اکثر ادبی مجالس میں شرکت کرنے اور اُن سے اکثر موضوعات پر تبادلۂ خیال کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک اچھے انسان اور بلند پایہ شاعر تھے۔ اُن کی وفات کے بعد میں نے اُن کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا جو ریڈیو کشمیر سرینگر سے براڈ کاسٹ ہوا۔ وہی مضمون آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہُوں۔ کِسی قابل ہو تو زیرِ ذکر کتاب میں شامِل کر کے ممنون کریں۔ شوریدہؔ مرحوم کی یاد میں ایک نظم بھی کہی ہے، وہ بھی ارسال خدمت ہے۔

جناب غلام رسول ملک، جناب محمد امین بچھ، جناب مرزا عارف بیگ اور اکیڈیمی کے دوسرے معزز ممبران کی خدمت میں میرا خلوص بھرا سلام عرض کریں۔ والسلام

آپ کا مقبول احمد
مُدیر ہفت روزہ "کشمیریت"

مقبول احمد

شوریدہ کاشمیری کی یاد میں

سُونی محفل ہے، مایوس ہے انجمن
آج افسردہ ہے شعر کا بانکپن
کِتنی بے رنگ ہے وادیٔ فکر و فن
آج خاموش ہے جیسے ہر اِک سُخن

وہ قلندر وہ درویش وہ ہم وطن
جو خِرد کو سمجھتا تھا دیوانہ پن
عمر بھر جس نے کی خدمتِ فکر و فن
جو سجاتا رہا شاعری کا چمن
گاہے مجنوں بنا تو گہے کوہکن
مُسکراتے ہوئے سختیاں کیں سہن
ناقدر دان لوگوں کے بھی درمیاں
شاعری کے لئے اُس کی ان تھک لگن

وہ مزاجاً تھا صُوفی بھی اور سادہ بھی
تھی طبیعت میں اُسکی رَچی سادگی
اِس لئے اُس پہ عاشق تھی سرِ ساوتی[1]
لکشمی[2] کی کبھی اُس نے پرواہ نہ کی
شعر پڑھتا بھی تھا اور پڑھاتا بھی تھا
شعر ہی کو سمجھتا تھا وہ زندگی
فکرِ اقبالؒ سے تھا متاثّر بہت
وہ سمجھتا تھا کیا ہے خُدا! کیا خودی

چشمِ دوراں سے اوجھل ہوا دفعتاً
حق نے بلوایا شوریدہ کو اپنے پاس
تھی غزل اُس کی محبُوب صنفِ سُخن
آج ہے نظم، قطعہ، رباعی اُداس
پڑ گئی ماند رنگینیٔ شعر بھی
لفظ و معنی سے گُم ہو گئی ہے مٹھاس
سچ ہے مقبول احمد کہ وہ چل بسا
اُس کی یادوں کا سرمایہ ہے اپنے پاس

آج بھی ذہن و دل کو معطّر کرے
سارے احباب کو اُس کے شعروں کی باس

---

[1] علم کی دیوی [2] دولت کی دیوی

تحریر:۔ مقبول احمد

پروفیسر شوریدہ کاشمیری

ایک روشن چراغ تھا نہ رہا!

دمکتے ہیں یوں شامِ غم داغ دل کے
چمکتے ہیں جیسے کہ گردوں پہ انجم
کسی حال میں بھی نہیں چین آتا
ہمیں ہو گیا ہے نہ معلوم کیا گم
کہاں ڈھونڈیں شوریدہ کو دوست اپنے
کہیں بیٹھا ہوگا وہ بیچارہ گم صم

سرزمینِ کشمیر کے مایہ ناز، کہنہ مشق، مخلص، بے ریا اور دیانت دار شاعر جناب شوریدہ کاشمیری کا اصل نام غلام محمد ملک تھا۔ آپ ۱۸ مارچ ۱۹۲۴ء کو تحصیل شوپیاں کے ایک مشہور گاؤں پنجورہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی شان سے پاس کرنے کے بعد سرینگر کے ایس پی کالج میں داخلہ لیا اور یہیں سے ان کی شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی حوصلہ افزائی نے ان کے اندر کے

شاعر کو باہر نکالنے میں مدد دی اور کالج کے زمانہ میں ہی ان کے بعض اشعار کافی مقبول ہوئے اور وہ شاعر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں جانے پہچانے گئے۔ دسمبر ۱۹۴۴ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد شوپیاں کے ہائی سکول میں مدرس ہو گئے لیکن پرائیویٹ طور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۵ء میں محکمہ خوراک میں ملازم ہو گئے لیکن جب ان کے احساسِ جمال کو ٹھیس لگی تو یہ نفع بخش نوکری چھوڑ کر نائب تحصیل داری کے امتحان میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک نائب تحصیل دار رہے لیکن حاکم بن کر تازہ مضامین کی تلاش ممکن نہ تھی اس لئے یہ شعر کہہ کر نائب تحصیل داری کو بھی لات ماردی۔

اے حکومت کیا توقع رکھتی ہے شاعر سے تو!
شاعرِ رنگین نوا کو کھا گئی فکرِ معاش
روز و شب رہتی ہے اسکو این و آں کی جستجو
کر سکے وہ کس طرح تازہ مضامیں کی تلاش

۱۹۵۶ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج اننت ناگ میں اردو کے لکچرر ہو گئے اور اسی کالج سے بحیثیت پروفیسر ۳۱ مارچ ۱۹۷۹ء کو ریٹائر ہوئے۔

شوریدہ کاشمیری مزاجاً صوفی اور سادگی پسند تھے، تصوّف سے خاص شغف رکھتے تھے۔ روایت اور قدروں کے محافظ شوریدہ کاشمیری اپنی شاعری کے تعلق سے بھی اپنی قدامت پسندی اور روایت پرستی کا احساس دلاتے تھے۔ مرحوم اپنے قلندرانہ مزاج کے اعتبار سے ایک اہم ترین شاعر تھے۔ شوریدہ ریاست میں عصر حاضر کے ان چند بزرگوں میں شامل ہیں جو ستم ہائے روزگار کے باوجود شعر کی زلفیں سنوارتے رہے۔ اور تلخیٔ حیات کو شاعری کے جام میں گھول کر پیتے رہے۔ شوریدہ کے لئے شاعری نہ صرف ذہنی انبساط بلکہ تحفظِ ذات کا وسیلہ بھی تھی۔ اردو کے بیشتر شعراء کی طرح غزل

اُن کی بھی محبوب صنف تھی لیکن انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں، رباعیات بھی اور قطعات بھی، اور لطف یہ کہ اِن تمام اصناف میں یکساں مہارت اور چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ شوریدہ کاشمیری نے مزاح نگاری اور مکتوب نگاری کے گلشن میں بھی کئی گل بوٹے کھلا کر اپنے صاحب قلم نثر نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ 'خطابِ خامہ' اُن کے ان مکتوبات پر مشتمل ہے جو انہوں نے ۳۰ سال کے عرصہ میں مختلف علمی، ادبی اور صحافتی شخصیتوں کو لکھے ہیں۔ 'خطابِ خامہ' کے مطالعہ سے شوریدہ کاشمیری کی شخصیت اور اخلاق و کردار کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں اور جو ذات اپنی فکر اور بنیادی خدوخال کے ساتھ شاعری میں کسی قدر چھپی ہوئی تھی اُس کا اظہار نثر میں کُھل کر آ گیا ہے۔ اِس کتاب سے شوریدہ مرحوم کے اُن تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو اُنہیں اردو دنیا کی عظیم شخصیتوں کے ساتھ رہے ہیں۔

شوریدہ کاشمیری کے دو شعری مجموعے 'جوشِ جنوں' اور 'جذبِ دروں' کے نام سے شائع ہو کر اہلِ ذوق حضرات سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ پروفیسر آلِ احمد سرور، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مظہر امام، ڈاکٹر حامدی کاشمیری اور پروفیسر شکیل الرحمان جیسے نامور اور معتبر ناقدین نے اُن کی تصانیف سے دیباچے اور پیش لفظ لکھ کر اُن کی ادبی قد و قامت کا اعتراف کیا ہے۔ قلندرانہ مزاج رکھنے والی اردو شاعری کی یہ منفرد آواز ہمارے درمیان سے اُٹھ گئی ہے۔ ۸۔ اپریل ۱۹۹۱ء کو یہ آواز خاموش ہو گئی۔

کسی کی دید سے وا دیدۂ دل ہو گیا جن کا
وہ سب اہلِ نظر میری نظر کی داد دیتے ہیں
عنادِل بھی ترنم ریز ہیں تیرے تغزل پر
وہ شوریدہ ترے سودائے سر کی داد دیتے ہیں

آخر پر شوریدہ کاشمیری کے کلام سے تخیل آرائی اور لفظ و پیکر کی نفاست کی چند مثالیں

قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

ریاضی، شاعری اور عشق تو بہ — تجھے شوریدہ اِن بتوں نے مارا
جامِ آبِ حرام پی نہ سکے — چلّے سے انتقام لیتے ہیں
اُس کو اس دور کا ولی سمجھو — جو گناہوں سے ہے کم آلودہ!
مسکرایا جنونِ بے پروا — آئی آواز جب سلاسل کی
چشمِ ساقی کا وہ پیام و کلام — استعارہ در استعارہ تھا
لوگ ہیں اور قیدِ بے زنجیر — اپنا اپنا مکان زنداں ہے
جانے کیوں موجِ آب ہے بے تاب — وصل میں بھی یہ سر پٹکتی ہے

میرے شہباز کے دو پر تخیّل اور تصوّر ہیں
ثریٰ سے ابتدا کر کے ثریّا سے گذرتا ہوں

.....

مولوی حمید اللہ

میرے محترم اُستاد

بڑے نجوم ثاقبہ کا ایک جھرمٹ اُفقِ اعلیٰ پر تاباں ہے اور تاباں رہے گا۔ یہ دانائے سُبل لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِی وحی خفی میں ثبت کر گئے۔ یہ ایک دائم منصور و غیر مخذول نفوسِ طاہرہ کی جماعت ہے جو روحِ دینِ متین سے سرمو منحرف نہ ہوگی، جو اقوامِ عالم پر شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیتی رہے گی۔ جن کے قلوب مولائے حقیقی کے عرفان اور سوز و گداز سے معمور و مخمور ہوتے ہیں۔ اعلائے کلمۃ اللہ اُن کا شعار ہے۔ لَا یَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ان کا کردار ہے۔ یہ حضرات مُعلّمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے نورِ ایمان کا اقتباس کرتے ہیں۔ ان کی بیع اِنَّ اللہَ اشْتَرٰی والی دفعہ دستورِ خداوندی سے ہو چکی ہے۔ یہ معاملۂ بیع فسخ نہیں ہو سکتا ہے۔

شوریدۂ کاشمیری کو اس طائفہ سے روحانی و جسمانی رابطہ تھا اس لئے یہ اشتیاق اور تعلق ان کو کبھی ندوہ لے گیا اور کبھی علی گڈھ، کبھی جلال آباد اور کبھی بھوپال۔

اس وادیٔ ذی زرع کی ارض خلّاب نے میر کبیر شیخ سرہندی جیسے اتقیاء کو کھینچ لیا، کوئی

مُفیض بنا تو کوئی مستفیض، کوئی حمزہ بنا تو کوئی یعقوب مرتضیٰ بنا، کوئی انور بنا تو کوئی اقبال بنا۔ یہ ربّانی پیداوار پھلتی پھولتی رہی یہاں تک کہ شوریدۂ شوریدہ گانِ رحمان انجمن انجم میں آئے۔ خودی و بیخودی، عرفان ذاتِ حق نے انہیں قلیل التکلّف، عمیقُ الایمان، سلیم الطبع، منکسر المزاج بنا دیا۔ اس طائرِ لاہوتی نے پرواز میں کوتاہی کے خوف سے کبھی رزقِ حلال پر مالِ حرام کو، جسکو اچھے اچھے نام دے دلا کر بخوشی کھایا کھلایا جاتا ہے، ترجیح نہیں دی۔

آپ نے تکریم و تحسین سے بے نیاز ہو کر کبھی بھی الوقتی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ یہ مومن کی شان ہوتی ہے۔ مستقل مزاج اور اولوالعزم ہونے کی وجہ سے ہر جھکاؤ اور بکاؤ سے محفوظ رہے۔ شہاب ثاقب کی طرح شیاطین الانس کو دھتکارتے رہے جو مختلف الوان میں حاضر ہوتے رہتے ہیں ؎

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں　　اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

آپ صرف پروفیسر نہ تھے بلکہ داعی الی الحق بھی تھے، نہ صرف استاد تھے بلکہ مربّی بھی اور مصلح بھی تھے۔ توحید اتنا رچا بسا تھا کہ اسکے خلاف کوئی بات قبول نہیں کرتے۔ بے باک ہو کر اعلانِ حق برملا فرماتے۔ إِنَّ الْمُؤْمِنَ يُجَاهِدُ بِسَيْفِهِ وَلِسَانِهِ (مسند احمد ج ۳ ص ۴۵۶) سچی بات ہے کہ مومن زبان و سنان سے راہِ حق میں کوشاں ہوتا ہے۔

شوریدہ شاعر کی حیثیت سے بھی حق و صداقت کے متوالے تھے۔ ارشادِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ :-

إِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكْمَةً۔ یقیناً بعض شعر حکمت ہوتے ہیں۔ (ترمذی)

جس شعر سے شعور ابھرے۔ جو دل کے نغمہائے خاموش کے لئے مضراب بنے، جمود کو حرکت دے اور فطرتِ کائنات اور حقیقتِ نفس الامری کی طرف انسان کی رہنمائی کرے۔ ناتواں کو توانا بنا دے، مظلوم کی ترجمانی کرے، ظالم کے ہاتھ روکے، غلامی، الحاد اور بے یقینی کی ظلمات سے آزادی اور ایمان و ایقان کے غیر متناہی سلاسل نور کی طرف لے جائے۔ جوش کے ساتھ ہوش

دے۔ مجاز سے حقیقت تک لے جائے تو یہ حکمتوں کا خزینہ ہے۔ تغیّرِ زمانہ کی وجہ سے معیار بھی اگر بدلتا چلا جائے لیکن صاحبِ قلم جو ناموسِ وَالْقلم، الّذِی عَلّمَ بِالْقَلَمَ سے آشنا ہو اسکا معیار تغیّر پذیر نہیں بلکہ سرمدی اور جاودانی ہے۔ وہ عقبیٰ کے فوز کبیر کیطرف دیکھتا ہے نہ کہ دنیا کے مال کثیر کی طرف۔ وہ دُرحَیْثُ دَارَالزّمَانُ کا قائل نہیں، وہ باطل کے ساتھ سمجھوتے کی جانب مائل نہیں، وہ حق کا متبع، اسکا طالب اور سائل ہوتا ہے، حق دیکھتے ہی یوں نغمہ سرا ہوتا ہے:

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

ان ہی صفاتِ حمیدہ کے ساتھ مولانائے رومی، غنی کشمیری، حکیم سنائی، اقبال کا کلام متصف تھا، شوریدہ صاحب کی شعر گوئی بھی ان کی عکاسی کرتی ہے۔

ارشادِ رسول کونین صلی اللہ علیہ وسلم ہے اِنّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا اور آپؐ کا معلم ہونا یعلّمھم الکتٰب سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ تو معلّم کو پیغمبر کریم سے تعلّقِ روحانی ہے۔ یہ نسبتِ محکمہ ہے۔ معلّم ایک عظیم مصلح ہوتا ہے۔ تاریخ اس پر ناطق گواہ ہے۔ اللہ اسکے پاس تلامذہ کی جماعت اس لئے بھیجتا ہے تاکہ کل کے مُطاعوں کی تربیت کرے۔ اس لئے اسے بلند پایہ کے اخلاق و آداب کے ساتھ طلباء کی موجودگی میں تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دینا چاہیئے۔ یہی جماعت کثیر النفع اور سریع الانقلاب بن جاتی ہے۔ علم نبوّت سے بڑھ کر کوئی علم نہیں جیسا کہ استادِ مکرم مرحوم شوریدہ صاحب کالج میں دورانِ تدریس کبھی فرمایا کرتے تھے۔ ہر فن چاہے علم حیاتیات ہو یا علم طبیعیات یا علم معاشیات وغیرہ وغیرہ، میں دورانِ تعلیم بندے کو اپنے مولیٰ سے جوڑا جاسکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ استاد کامل و حاذق ہو اور جرأت کے ساتھ یہ سمجھایا جائے کہ علوم انسانی محدود ہیں۔ سائنس کے مختلف شعبہ جات محدود و متناہی ہیں اور یہ علماء کون کے نزدیک بھی مسلّم ہے یہی تو وجہ ہے کہ سائنسدانوں نے ایک کتاب "قاموس جہالت" حوالہ قرطاس کی جس میں بہت سوالات کا جواب انہوں نے لَا اَدْرِیْ

سے دیا ہے۔ غرض یہ کہ انسانیت کے لئے غیر مخلوق، غیر وضعی قانون الہٰی ہی رہنمائی کر سکتا ہے۔

الحمد للہ مجھے ایسے ہی کئی اساتذہ ملے جن کا فیض اب بھی جاری ہے۔ ان میں ملک شوریدہ صاحب ایک گرامی قدر شخصیت تھے۔ اللہ پاک اُن پر عیونِ رحمت جاری فرمادے۔ وَلَا اُزَكِّي عَلَى اللهِ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔

نَوَّرَ اللّٰهُ مَرْقَدَهٗ وَجَعَلَ الْجَنَّةَ مَثْوَاهُ

غلام نبی ناظر

شوریدہ ـــــ بلبلِ کشمیر اُردو نغمہ خواں

(محترم شوریدہ صاحب کی وفات پر)

آہ وہ جو تھا ہمارا کیا نہ تھا ؟ — کیا لکھوں رنگ اُس کے، وہ کیسا نہ تھا؟

بُلبلِ کشمیر اُردو نغمہ خواں — چہچہاتا تھا کبھی تھکتا نہ تھا

تھیں جبیں میں قید جسکی وُسعتیں — سر واُس کے ساتھ کب اُٹھا نہ تھا؟

وہ شریفُ النفس خوشخو، خوشخیال — عُجب کا پندار کا مارا نہ تھا

گُلشنِ پنجورہ کا وہ عندلیب — کیا وطن میں جا بجا گویا نہ تھا؟

حاتف "جوشِ جنوں"، جذبِ دروں — اور خطابِ خامۂ فرمایا نہ تھا؟

شاعرِ رنگیں نوا، طاعت گذار — دردِ دِل اُس سے کبھی چھوٹا نہ تھا؟

سادگی اپنی پہ نازاں دمبدم — سچ دمج اُس کے دِل کا بھلا دانہ تھا

بس کتابوں میں، قلم کے واسطے — اور کسی سے جیسے کچھ رشتہ نہ تھا

جا بجا اُستاد، اُستادوں کا وہ — کیا کہوں روشن تھا، سیّارہ نہ تھا

زینتِ جنّت ہو اُس کا بھی وجود — نیک دل شاعر کوئی اُس سا نہ تھا

"ہوشمند شوریدہ ساکت" ہوگیا

۱۴۱۱ھ

سال ناظر کے لئے اچھا نہ تھا

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

Title [redacted]

Author [redacted]

Accession No. [redacted]

Call No. 8 [redacted]

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

Title _____

Author _____

Accession No. _____

Call No. _____

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

اِقبال اکیڈیمی جموں و کشمیر کا قیام اس غرض کے لئے
عمل میں لایا گیا ہے تاکہ اِشاعت کُتب، سیمناروں، مُباحثوں
اور مَجالسِ مُذاکرہ وغیرہ کے ذریعے تعلیماتِ اِقبال کو ان کے
صحیح تَناظر میں عام کیا جائے۔ اکیڈمی چاہتی ہے کہ کلامِ اِقبال
کی تشریح و تعبیر باہر سے دَرآمد شُدہ نظریات کی روشنی میں
نہیں بلکہ خُدا، اِنسان اور کائنات کے بارے میں اِقبال کے
اپنے واضح اور غیر مُبہم بیانات کی روشنی میں اور اس نظریۂ زندگی
اور نِظامِ فِکر کے مُطابق کی جائے جو ان کی تمام نِگارشات
پر حاوی ہے۔ اِقبال کے شاعرانہ کارنامے کو بھی اسی تناظر
میں دیکھا جانا چاہیئے۔ ــــــــــــــــ ☆